"بڑے آدمیوں کے سوانحی حالات ہمارے لئے بہترین مشعل ہدایت ہیں"

مولانا عنایت اللہ دہلوی

مرتبہ

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

نومبر ۱۹۳۹ء

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام ضمیر احمد خاں غوری پرنٹر چھپی)

حیدرآباد بک ڈپو، حیدرآباد دکن

مولوی عنایت اللہ دہلوی

سوانح حیات مولانا عنایت اللہ

مترجم اردو "سپینش اسلام"

(از شیخ محمد اسماعیل - سکریٹری "حالی اکیڈمی" پانی پت)

والدین اور خاندان مولوی محمد عنایت اللہ صاحب خان بہادر شمس العلماء مولانا محمد ذکاءاللہ مرحوم کے لائق فرزند ہیں۔ مولانا محمد ذکاءاللہ صاحب مرحوم اردو زبان کے سب سے زیادہ کثیر التصانیف مولف۔ اعلیٰ درجہ کے مترجم۔ زبردست انشا پرداز۔ بہت بڑے ماہر ریاضی و سائنس۔ میور سنٹرل کالج الہ آباد کے پروفیسر۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور سرسید مرحوم کے گہرے اور قلبی دوستوں میں سے پرانی وضع کے ایک باکمال بزرگ تھے۔ مولوی عنایت اللہ صاحب کی والدہ ایک بہت لائق خاتون اور سید زادی تھیں۔ مولوی صاحب کا خاندان شیخ صدیقی ہے۔

تاریخ پیدائش آپ دہلی کے مشہور محلہ "قاضی واڑہ" میں دوشنبہ کے روز ۱۰ر شعبان ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۵ر نومبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔

دہلی میں ابتدائی تعلیم آپ کی عمر چار برس کی تھی کہ مولانا ذکاءاللہ صاحب نے آپ کے پڑھانے کے لئے ایک معلم لالہ شوجی رام کو مقرر کیا۔ کچھ دنوں ان سے تعلیم پائی تھی کہ پھر آپ کو ماڈل سکول میں جو نارمل سکول دہلی سے متعلق کلاں محل میں تھا داخل کرا دیا۔ کچھ عرصہ یہاں پڑھنے کے بعد "شاہ جی کے چھتہ" میں ایک گورنمنٹ سکول تھا وہاں بٹھا دیا۔ بعد میں وہاں سے اٹھا کر عربک سکول میں داخل کرا دیا۔ یہاں تیسری جماعت میں پڑھتے تھے کہ مولانا ذکاءاللہ انھیں اپنے ساتھ الہ آباد لے گئے تاکہ اپنی نگرانی میں بیٹے کی تعلیم کا معقول انتظام کر سکیں۔

دہلی سے الہ آباد تک دہلی سے الہ آباد تک کس طرح پہنچے؟ اس کی بہت ہی دلچسپ اور پرلطف کیفیت خود مولوی عنایت اللہ صاحب کی زبان سے سنیئے:۔

"غالباً جولائی ۱۸۷۵ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم جو اُس وقت میور کالج الٰہ آباد میں پروفیسر تھے گرمیوں کی تعطیل دہلی میں ختم کر کے الٰہ آباد واپس جانے لگے۔ اِس مرتبہ انھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لیجانا چاہا تاکہ الٰہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستہ میں سیّد صاحب (سر سیّد مرحوم) کے پاس علی گڈھ میں قیام کرنے کا قصد کر لیا۔ میری عمر اس وقت آٹھ برس کچھ مہینے کی تھی اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جُدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو اُنھوں نے ہم دونوں کو گلے لگایا۔ پیار کیا۔ اور کوئی دُعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا۔ مگر میں نے ضبط کیا اور دوڑ کر والد کے پاس چلا گیا اس خوف سے کہ کہیں مجھے روتا دیکھ لیا تو پھر ساتھ نہ لیجائیں گے۔

آج کا دن میرے لئے نئے نئے تجربوں اور حیرتوں کا تھا۔ اس سے پہلے میں کبھی ریل میں نہ بیٹھا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا کبھی دوڑ کر اس کھڑکی سے مُنہ لگا کر جھانکتا تھا۔ کبھی اُس کھڑکی سے۔ اور سب سے زیادہ بے قراری اس بات کی تھی کہ دیکھئے ریل کب چلتی ہے؟ اور کیونکر چلتی ہے؟ آخر کار یہ وقت بھی آگیا ریل کھسکی۔ اسٹیشن کی جتنی صُورتیں تھیں ایک ایک کر کے پیچھے رہتی گئیں۔ ٹرین کبھی سیدھی کبھی سانپ کی طرح لہراتی جمنا کا پُل اُترتے ہی فرّاٹے بھرنے لگی۔ پہیّوں کی لَے دار آوازیں اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک اُمنگ پیدا کرنے لگے اب یہ معلوم ہوا کہ میدان۔ کھیت۔ گاؤں۔ آدمی۔ درخت۔ مویشی کوئی ایسا نہیں تھا جو دلّی کی طرف نہ بھاگا جاتا ہو۔ میں اپنے وطن سے نکلا اور یہ میرے وطن کی طرف چلے دُور کی چیزیں آہستہ اور پاس کی چیزیں بے تحاشا دَوڑتی نظر آئیں۔ جدھر دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے معلوم ہوئے۔ اُوپر سُورج تھا اور چلتے پھرتے بادل۔ نیچے دھوپ تھی اور چھاؤں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ گھٹا دُور نظر آتی تھی۔ مگر تھوڑی دیر میں ٹرین دھوپ سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آجاتی اور ہر طرف اندھیرا سا ہو جاتا۔ اور مینہ ترچھی ترچھی دھاروں

میں برسنے لگتا۔ بادل کی گرج جسے سُن کر گھر میں ڈر لگا کرتا تھا۔ اب یہاں سُنائی بھی دیتی تو بہت ہلکی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی۔ اور ٹرین اس گھٹا اور اندھیرے کو پیچھے چھوڑ روشن مطلع میں آجاتی۔

جب کوئی سٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹڑی بدلتا اور پھر کون لڑکا ایسا ہو گا جس کا مُنہ کھڑکی سے باہر ہو اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ بجانے لگے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر ریل کے ٹھہرتے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ۔ گارڈ کا اپنی گاڑی سے اُتر کر انجن تک بخط مستقیم جانا اور پھر ہری جھنڈی دکھا ٹرین کو چلتا کرنا۔ اور اپنی گاڑی کی طرف آ چلتی ریل میں دوڑ کر اس کے پائے دان پر کھڑا ہو جانا۔ بڑے اسٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی چل رہا ہے۔ کوئی صاف نظر آتا ہے۔ کوئی دھوئیں اور بھاپ کے بقّوں میں آدھا چھُپا ہے مگر چیختے چلاتے سب ہیں۔ پھر ٹرین کا ہلکی چال سے دفعتاً بڑی گرج اور لرزے اسٹیشن کی اُونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم۔ اور انگریزی ہوٹلوں کے چمکتے سازوسامان کی جھلک دکھا کر رُک جانا۔ ٹکٹ کلکٹروں کا چلتی گاڑی میں آن پہنچنا۔ قلیوں اور مسافروں کا شور۔ سودے والوں کی بے تکی بولیاں گو یہ سب معمولی چیزیں تھیں مگر میرے لئے تو آج دُنیا کے مُشاہدوں کا ایک دفتر کھُل گیا تھا۔ جو نئی چیز خود دیکھتا تھا چاہتا تھا کہ والد بھی اُسے دیکھیں۔ سوالوں کی انتہا نہ تھی مگر وہ زیادہ متوجہ نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی سے باہر مُنہ رکھنے کو بار بار منع کرتے تھے۔ کئی دفعہ آنکھوں میں کوئلے کی خاک بھی پڑی مگر میں دیکھنے سے نہ ہارا۔ ایک دفعہ کچھ تھکن سی معلوم ہوئی تو کھڑکی کے پاس سے مُنہ ہٹا لیا۔ آنکھیں ملتا رہا۔ پھر کچھ اماں یاد آنے لگیں۔ دل کُڑھا چُپ سی لگی۔ لیٹا اور نیند آ گئی۔ سو کر اُٹھا۔ پھر مُنہ کھڑکی سے باہر تھا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڈھ آگیا۔ والد یہاں اُترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آکر کہا کہ سیّد صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم سب اس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی سی دیر کے بعد ایک احاطہ میں جو مجھے باغ معلوم ہوا داخل ہوئے

اور ایک بڑے بنگلے کے سامنے برساتی میں آکر گاڑی ٹھیر گئی۔

میں نے اب تک انگریزی وضع کے مکان دُور سے دیکھے تھے کبھی اُن کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اُتر کر ہم کئی کمروں میں سے گزرنے کے بعد ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا۔ اس کمرے کے سب سے بڑے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ پنکھا چل رہا تھا۔ مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ٹٹی کے قریب ایک میز جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں بہت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بڑے بھاری بھر کم آدمی۔ سفید سر۔ سفید ڈاڑھی۔ سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور اُن میں سلیپر جو مجھے قالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا کلّہ۔ عینک لگی ہوئی۔ برہنہ سر بیٹھے تھے۔ یہ سیّد احمد خاں صاحب تھے جنھیں دلّی کے بعض لوگ صرف "علی گڈھ والا" کہنا کافی سمجھتے تھے۔ اور وہ ایک خوف اور پرہیز کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ والد کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے جھکے اُٹھے۔ اور یہ کہہ کر کہ "آپ آگئے" والد سے مصافحہ کیا۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا "ارے یہ کون ہیں"۔ ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ خوب ہنسے اور والد سے باتیں کرنے لگے۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا باتیں تھیں۔ اب میں کبھی سیّد صاحب کی صورت کو دیکھتا تھا۔ اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر زرد حاشیہ دے کر سُرخ اور نیلی دھاریوں کی دری۔ اور سفید براق سی چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ کہیں کہیں سنہری چوکھٹوں میں تصویریں لٹکی ہوئیں جن میں پہاڑ۔ چشمے اور سبزہ زار نظر آتے تھے۔ اور سب پر ایک سکوت کا عالم تھا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اسی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کورنس میرے لئے اس قدر پُرلطف تھا کہ اب بڑی سے بڑی نمائش گاہ بھی وہ لطف نہیں دے سکتی

اس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد جب باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تھے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کورنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں ان میں سب سے زیادہ دلکش سنگِ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا تھا۔ یہ مجھ کو منصور کا مقبرہ معلوم ہوتا تھا۔ جسے میں دہلی میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اُس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو قابلِ رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچے۔

سید صاحب اس قدر لحیم شحیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد اُن کے سامنے بہت دُبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے دراں حالیکہ اس سے پہلے میں اُن کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھتے تھے۔ میرے بڑے بھائی کُرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ مجھ سے بھی کہا گیا تھا۔ مگر میں نے نہ سُنا کیونکہ بالکل عدیم الفرصت تھا۔ سید صاحب کے قریب اُن کی میز کے پاس کھڑا رہا۔ اس وقت ایک اور چیز ایسی تھی جس کی طرف دیکھنے میں مَیں بالکل محو تھا۔ یہ سید صاحب کے لکھنے کی دوات تھی۔ اس کے اوپر کا ڈھکنا کہیں سونے کا کہیں چاندی کا ہوبہو شیر ببر کا سر معلوم ہوتا تھا۔ بالکل اسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی تھی۔ اور اُس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی خوب چمکتی تھیں۔ آخرکار اس خوابِ حیرت سے جاگنا پڑا۔ سید صاحب نے پوچھا "تم کیا پڑھتے ہو؟" میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا "اُردو کی چوتھی (کتاب) ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری (کتاب) اور رائل ریڈر پڑھتا ہوں۔" اس جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ علم وفضل باعثِ مسرت ہوا ہو۔ یہ دونوں صاحب باتیں بھی کرتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی

لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذ والد کو دیئے۔ جب وہ اُن کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن جو مصروفیت مجھ کو تھی وہ ان دونوں بزرگوں کو کب نصیب ہو سکتی تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ یہ مشکل درپیش تھی کہ میں کسی چیز کو اٹھا کر اُس سے کوئی ذاتی تجربہ حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ اتنی جرأت ہوتی تھی کہ والد سے ایک ایک چیز کو پوچھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کروں۔ اتنے میں ایک نیا واقعہ پیش آیا۔ سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی ہیبت آواز میں کہا "پنکھا روکو" پنکھا فوراً رُک گیا۔ اور سید صاحب نے بکس میں سے ایک چُرٹ نکالکر دیا سلائی جلائی۔ اور جب دیا سلائی چُرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو اُن کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اور اب معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں تھی وہ چُرٹ کی تھی۔ اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا۔ اور یہ اُس خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اُس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب وغیرہ رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس بیٹھ کر جب والد اس کمرے میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی اُن کے ساتھ آئے۔ گو اس کمرے میں دلکش چیزیں کم تھیں مگر غسل خانہ کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کے کسی چیز کو برتنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے پہننے کے کمرے میں آئینہ کی خوبصورت میز پر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ میں اُن سے ڈرا۔ کیونکہ اُن کو میرے ساتھ خاص دشمنی تھی۔ جہاں میں نے خوش ہو کر اُن کو ہاتھ لگایا اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر میرے حق میں مشکلیں پیدا کر دیتی تھیں۔

شام ہوئی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے۔ کوٹھی کے احاطہ میں ایک طرف کو باغ تھا۔ اس کے سرے پر ایک چبوترہ تھا۔ اس پر بہت سی کرسیاں رکھی تھیں۔ کھانے کے کمرے کے سامنے گھاس کا وہ بڑا تختہ جس کے چاروں طرف سُرخ اینٹوں کی نالیاں اور پھولوں کی کیاریاں اور گوشے پر بڑے بڑے گملے رکھے تھے اس وقت موجود نہ تھا۔ یہاں چھوٹی

چھوٹی کیاریوں میں گلاب کے درخت تھے اور کچی روشوں کے گرد مہندیوں کی باڑ لگی تھی۔ اِن سے جنوب کی جانب وہ چبوترہ تھا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اور غالباً اس زمانہ کے بارہ تیرہ برس کے بعد اسی چبوترہ کی جگہ ایک خوبصورت کمرہ بنایا گیا جو "میاں مسعود" کا مکتب کہلاتا تھا۔ چبوترے کے کنارے پھولوں کے گملے رکھے تھے اور تین طرف درخت تھے جو غالباً پھلوں کے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سیّد صاحب اور والد پھر باتیں کرنے لگے اتنے میں سیّد صاحب کے چند دوست گاڑیوں سے اُتر کر آئے۔ ان میں دو صاحب یاد ہیں ایک مولوی فریدالدین تھے اور دوسرے خواجہ محمد یوسف۔ مولوی فریدالدین صاحب آتے ہی مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے اُن کی باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں۔ کیونکہ جو بات پوچھتے تھے اِس طرح پُوچھتے تھے جیسے میرے ہمیشہ کے جاننے والوں میں ہیں۔ حالانکہ میں نے انھیں آج ہی دیکھا تھا۔ اس موقعہ کی صرف ایک بات مجھے خوب یاد ہے۔ سیّد صاحب نے مجھے اپنے قریب بُلایا۔ اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا "مُنہ کھولو" میں نے مُنہ کھولا۔ کہنے لگے "ارے اس لڑکے کے مُنہ میں سے تو خون نکل رہا ہے۔ توبہ توبہ"! میں دتی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لئے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے مُنہ بند کر لیا اور سمجھ گیا کہ پان کھانا بہت بُری بات ہے۔ گو جوان ہو کر پان کھانے کی عادت مُدت تک نہ چھوڑی۔

جب کچھ رات ہو گئی تو آدمی نے آ کر کہا "کھانا میز پر ہے"! سب لوگ اُٹھے۔ اور کھانے کے کمرے میں آئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سپید چادر۔ چینی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چمچے کانٹے۔ ہاتھی دانت کے دستوں کی چھُریاں رکھی تھیں۔ دیوار گیریوں کے علاوہ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے۔ پنکھا چل رہا تھا۔ اب مجھے اپنے گھر کا دسترخوان۔ برتن اور فتیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اُجلا بچھوایا کرتی تھیں مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی مہمان آئے تو برتے جاتے تھے۔ گلاس گرمیوں میں یا رمضان میں شربت

پینے کے لئے نکالے جاتے تھے۔ مائیں اُن کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھریاں اور چاندی کے کانٹے میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا فتیل سوز روز بجھوایا جاتا تھا۔ مگر اس کی صورت شکل اور ٹمٹماتی روشنی ان لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہوں پر قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بڑی لمبی ڈاڑھی کا دُبلا پتلا سوکھا مگر بے حد چُست اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ چمچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابی میں بڈھے خانساماں نے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے کچھ غور نہ کیا مگر وہ گھر کا سا نہ تھا۔ نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔ جب ہم دونوں کھا چکے تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان بچوں کو اُن کے پلنگوں پر لیجا کر سُلا دو"

ہمارے پلنگ ڈرائنگ روم کے غرب رویہ برآمدے میں بچھے تھے۔ اس زمانے میں یہاں دوہرا برآمدہ نہ تھا۔ اور نہ وہ بڑا کمرہ تھا جو سید محمود والا کمرہ مشہور تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ برسات شروع ہو گئی تھی۔ برآمدہ کے سامنے کیاریوں میں پانی بھرا تھا اور اُن میں ہزارہا مینڈک بول رہے تھے۔ کہیں ہلکی ٹرٹرا اور کہیں تیز ٹرٹر۔ کبھی کبھی ڈبکیوں کی آوازیں اور پھر یہ سب مل کر ایسا شور پیدا کرتی تھیں کہ میں تھوڑی دیر تک جاگتا ہی رہا۔ پھر جب نیند آنے لگی تو یہ شور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کہیں دُور کسی بڑی دیگ میں پانی جوش کھا رہا ہو۔

صُبح ہوتے چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھُلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں اُن کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا کہ کیا الٰہ آباد میں یہ سب چیزیں ہوں گی۔ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

اُس دن کا ایک واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ جب کچھ دن چڑھا تو ایک فٹن دو گھوڑوں

کی آئی۔ اور مولوی فرید الدین صاحب اس میں سے اُترے۔ اور تھوڑی دیر سید صاحب سے باتیں کرکے ہم سب کو اپنی کوٹھی پر لے گئے۔ سید صاحب ساتھ نہ تھے۔ رستہ میں کالج کے احاطہ میں سے گذرے۔ دو تین پھونس کے بنگلے۔ اور ایک جگہ دو ایک کوٹھڑیاں سی لال اینٹوں اور ڈاٹ کی نظر آئیں۔ جیسی بعد کو کبھی کبھی انگریزی چھاؤنیوں میں دیکھنے میں آئیں۔ مدرسے کے لڑکے کہیں نظر نہیں آئے۔ اور نہ گاڑی سے اُترنے کی نوبت آئی۔ البتہ جب کالج کے ایک دروازے کے قریب پہنچے تو وہاں جا بجا پانی کھڑا تھا۔ رات کو مینہ خوب برس چکا تھا یہاں گاڑی کے پہیئے دلدل میں پھنس گئے۔ گھوڑے بگڑنے لگے۔ سب لوگ گاڑی سے اُترے اور زور لگا کر گاڑی کو آگے کھسکایا۔ دروازے پر پہنچ کر سب اُترے۔ دروازے کے دونوں پیل پایوں پر سنگ مرمر کی لوحیں لگی تھیں۔ میں نے انگریزی میں سید ظہور حسین اور گیٹ کا لفظ جلدی سے پڑھ دیا۔ مولوی فرید الدین صاحب نے جھٹ پیٹھ ٹھونکی اور کہا "ارے تُو انگریزی بھی پڑھنی جانتا ہے" دروازے سے ملی ہوئی مشرق کی طرف احاطہ کی سنگین جالیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ میں جالیوں پر لوگوں کے نام پڑھتا ہوا دُور تک دوڑا چلا گیا۔ والد نے آواز دے کر بُلایا۔ اور اب ہم سب مولوی صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ (مولوی صاحب اُس کوٹھی میں رہتے تھے جو سائینٹفک سوسائیٹی کے باغ سے بہت قریب تھی۔ اسے اصل میں سید صاحب نے اپنے رہنے کے لئے جب وہ علی گڈھ میں صدر الصدور تھے بنوایا تھا مگر غالباً ولایت سے آنے کے بعد قرضہ بڑھا اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے ہاتھ اسے فروخت کر دیا۔ آجکل معلوم نہیں وہ کیوں بھوپال ہاؤس کے نام سے مشہور ہے) دس بجے کے قریب سب نے مولوی صاحب ہی کے ہاں کھانا کھایا۔ اب یہ یاد نہیں آتا کہ ہم سید صاحب کی کوٹھی پر کب اور کس طرح واپس گئے۔

والد نے علی گڈھ میں ایک دن کی جگہ جو اُن کا معمول تھا دو دن قیام کیا۔ اس خیال سے کہ اگر ماں کی جدائی سے بچوں کی صحت پر بُرا اثر ہو تو دلی واپس کر دیں۔ بڑے بھائی کو گھر یاد آنے لگا تھا اور وہ سُست بھی تھے۔ مگر میرے کہنے سے آگے چلنے پر تیار ہو گئے تیسرے دن اُسی وقت کی ریل سے جس سے علی گڈھ پہنچے تھے الٰہ آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن

سورج ابھی اچھی طرح نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سیّد صاحب کے طرزِ معاشرت پر یہ چھوٹا سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا مگر اُن کے گھر کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی یہی ہوتیں۔ اور یہ شوق پیدا ہوا کہ اب جہاں رہوں وہاں کی ہوا بھی ایسی ہی اچھی ہو ایسے ہی کھلے میدان ہوں۔ باغ ہو۔ پھول ہوں۔ گرد وپیش کی سب چیزیں صاف اور پاکیزہ چمکتی ہوئی ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ کوئی چیز میلی نہ ہو۔ یہ خیال وہ تھا جس کا بہت کچھ اثر اور شوق تمام عمر رہا اور اب تک ہے۔

صبح ہی ریل سے اُتر کر گھر پہنچے۔ مگر نہ وہ علی گڈھ تھا اور نہ سیّد صاحب کی کوٹھی اور اس کا باغ اور عمدہ سامان تھا۔ مکان بڑا تھا۔ چاندنیاں اُجلی بچھی ہوئی تھیں۔ سب چیزیں سلیقے سے رکھی تھیں خصوصاً والد کی کتابوں کی بڑی الماری میں رنگ برنگ کی جلدیں اور اُن پر سنہری حروف بہت اچھے معلوم ہوتے تھے۔ پہنچتے ہی تھوڑی دیر تک گھر کا جائزہ لیتا پھرا۔ دالان۔ کوٹھڑیاں۔ تہ خانہ کے موکھے جھانک کر دیکھے۔ نوکروں سے جو خاص طور پر متوجہ تھے۔ جرح کی کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے؟ اور اس کے بعد دوڑ کر اپنے پلنگ پر آن بیٹھا۔ آسمان پر تاریک بادل چھائے تھے۔ اندھیرے سے جی گھبرایا۔ اور اب چار دن کے بعد امّاں یاد آئیں اور بہت یاد آئیں۔ دلّی کے گھر کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ "اب امّاں جان اشراق کی نماز پڑھ کر جانماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی ہوں گی۔ پکانے والی ماماں پوچھ رہی ہوگی "بیوی کیا پکے گا؟" انھوں نے کچھ بھی جواب نہ دیا ہوگا کیونکہ ہمارے لئے دُعائیں کر رہی ہوں گی۔ اور کہا بھی ہوگا تو یہی کہا ہوگا کہ بچے تو خدا رکھے سدھارے، کیا بتاؤں کیا پکاؤ گی" (اُس وقت تک صرف ہم دو بھائی تھے۔ اس لئے ہمارے چلے آنے سے والدہ بالکل تنہا رہ گئیں) گھر کی اور صورتیں بھی خیال میں آنے لگیں۔" یہاں دھوپ ہوگی۔ وہاں چھاؤں ہوگی۔ کوٹھے کی سب سے اونچی منڈیر پر چیل روز آکر بیٹھا کرتی تھی اب آگئی ہوگی پچھیتے پر مینائیں لڑتی ہوں گی۔ ایک آدھ کوّا بھی باورچی خانہ کی طرف اُتر آیا ہوگا۔" یہ سب صورتیں تو پرچھائیوں کی طرح آئیں اور گئیں۔ مگر امّاں کی ایک شمع ایسی تھی کہ جہاں کھیل کود سے تھک کر

چُپ بیٹھا اور وہ روشن ہو گئی۔ پلنگ پر دیر تک مُنہ لپیٹے چپکے چپکے روتا رہتا۔ رونے سے بڑھ کر تکلیف اس کے چھپانے میں ہوتی تھی یہی ڈر رہتا کہ اگر ظاہر ہو گیا تو دلی واپس جانا پڑے گا اس خیال سے دل شرمندہ ہوتا تھا۔ اور یہ منصوبہ بھی غارت ہوتا تھا کہ ایک چھوٹا کمرہ خوب آراستہ کرکے اُس میں پڑھا کروں گا۔

الہ آباد میں کوئی کمرہ تو ایسا نہ ملا جسے آراستہ کرتا لیکن پڑھنے کی تین فٹ لمبی دو فٹ چوڑی میز جو ملی اُسے میں نے رفتہ رفتہ اپنے لئے ایک نہایت وسیع اور خوبصورت دُنیا بنالیا سامان کچھ بھی نہ تھا۔ میز کی سبز چادر پر شیشے کی ایک دوات تھی۔ دو تین چھوٹے چھوٹے ٹین کے کھلونے تھے۔ کچھ کتابیں اور مشق کی کاپیاں تھیں۔ ایک چھوٹا سا ٹائم پیس تھا جو اُلٹی چابی دینے سے کبھی ٹھیک نہ چلا۔ ایک دندانے پڑا نوک ٹوٹا چاقو بھی تھا جو کبھی کھویا جاتا تھا۔ کبھی مل جاتا تھا۔ دو واسطی اور دو انگریزی قلم تھے جنھیں ہم اُس زمانے میں "ڈنک" کہتے تھے۔ دو چار رنگین روشنائیوں کی سیپیاں اور کئی رنگ کی پنسلیں تھیں۔ ایک بہت مختصر سا دُو دیا رنگ کے گلوب کا لیمپ بھی تھا جو دن کو بھی میری میز سے ہٹنے نہ پاتا تھا۔ رنگین روشنائیاں اور پنسلیں شرطِ زندگی تھیں۔ کیونکہ جب کوئی انگریزی کی نئی ریڈر شروع کی جاتی تو اس کا سبق پڑھنے سے پہلے اس کی تمام تصویروں میں رنگ بھر دینا بڑا ضروری کام تھا۔ حالانکہ والد کئی دفعہ ناراض بھی ہوئے کہ کتاب خراب نہیں کیا کرتے۔ مگر میں اپنی مُصوّری کا نمونہ اُن کو ضرور دکھا دیتا تھا۔ یہ کس کو یاد رہتا کہ پھر خفا ہوں گے۔ جے پور کا بنا ہوا سنگ سفید کا ایک رنگین گینڈا تھا جس کے پاؤں میں مہندی۔ ماتھے پر ٹیکا۔ اور ناک پر سنہری رنگ کا ایک سینگ تھا۔ یہ رواں عمر اور نیرنگیِ مذاق کے ساتھ ساتھ کچھ کم نصف صدی تک مختلف حیثیتوں سے میری خدمت میں رہا۔ کبھی گردن میں ڈور بندھی اور چابک مار مار کر چلایا گیا کبھی پیار کی باتیں ہوتیں۔ کبھی سخت و سُست سُنتا رہا۔ میلا کچیلا ہوا تو غسل اتنے دیے گئے کہ رفتہ رفتہ اُس کا سارا رنگ اُڑ گیا۔ نہ پاؤں کی مہندی رہی نہ ماتھے کا ٹیکا۔ کبھی قینچی یا چاقو سے ناک کے سینگ پر حسب ضرورت ترمیم کی گئی۔ ناک بھی ٹوٹی اور چاقو اور قینچی کو بھی زوال آیا۔ کبھی اُس سے دیواروں میں کیلیں ٹھونکنے کے لئے ہتوڑی کا کام

لیا گیا۔ اور جب میں اور وہ دونوں پنشن کے قابل ہوئے تو مدتوں میرے کاغذوں پر "پیپر ویٹ" کی جگہ میز فرش بن کر بیٹھا۔ آخر کار حیدر آباد کے ایک نوکر نے پتھر پر گرا کر اُس کی مٹھیک اور چاروں پاؤں توڑ دیئے۔ چنانچہ اب وہ اسی حال سے چیتھڑوں کے ایک پرانے بکس میں بند جیسے تابوت میں مصر کی ممی ہو اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ بے جان کھلونا میرے لئے برسوں تک ایک زندہ ہستی رہا۔ میرے بعض بچپن کے دوستوں سے بھی اس کی ملاقات تھی اور بڈھے ہو کر بھی وہ کبھی کبھی اس کی خیر و عافیت پوچھ لیا کرتے تھے۔ ایک خوبصورت کمرے کی حسرت تو صرف پڑھنے کی میز کے آراستہ کرنے میں پوری ہوئی۔ مگر گھر میں درخت مطلق نہ تھے۔ صحن بڑا تھا۔ اس کے ایک گوشہ میں میرے اصرار سے والد نے ایک چمن بنوا دیا تھا اس میں دو ایک درخت پھلوں کے باقی پھولوں کے لگائے گئے۔ اس وقت کا شوق کیا بتاؤں کیا تھا۔ نئی نئی باتیں نکالا کرتا تھا۔ جس دن خود کوئی بیج بوتا تھا تو ایک چھوٹی سی کتاب میں دن اور تاریخ لکھ لیتا تھا۔ جب وہ پھوٹتا تھا تو اس کی تاریخ بھی درج کرتا تھا۔ کچھ دنوں یہ التزام رہا مگر پھر اور باتوں میں دھیان بٹا۔ اور جہاں اور اکثر چیزیں روز کھوئی جاتی تھیں وہ کتاب بھی کھوئی گئی۔ مجھ کو اپنی سب چیزوں سے محبت تھی۔ مگر وہ سب بے وفا تھیں۔ جب ڈھونڈتا تھا کہیں نہ کہیں چھپ بیٹھتی تھیں۔ اور غفلت کا الزام والد مجھ کو دیتے تھے۔"

الٰہ آباد کا قیام

علی گڈھ سے جس وقت مولوی عنایت اللہ چلے تو سرسید کی طرز معاشرت اور اُن کے گرد و پیش کی صفائی اور لطافت کا اُن کے ننھے دل پر اس قدر گہرا اور دیرپا اثر ہوا کہ وہ اُسے تمام عمر نہ بھولے ان کے ہشیار دماغ نے اُسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ اُنھیں بھی ایسی ہی صفائی کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اور اُن کے گرد و پیش کی چیزیں بھی اتنی ہی لطیف اور نازک ہونی چاہئیں جیسی وہ علی گڈھ میں سید صاحب کے بنگلہ میں دیکھ آئے تھے۔ بعد کی زندگی میں اُن کی یہ خواہش اُن کی طبیعت ثانیہ بن گئی۔ اور اب جب کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، اُن کی اس صفائی پسندی میں فرق نہیں آیا۔ وہ اگرچہ سادگی کے ساتھ رہتے ہیں، مگر کھانے پینے۔ پہننے اوڑھنے، لکھنے پڑھنے غرض ہر چیز میں صفائی اور لطافت کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔

الہ آباد پہنچتے ہی انھوں نے سرسید کی طرز سکونت کی چھوٹی سی نقلی اتارنی شروع کردی! ورجیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے انھوں نے اپنی میز کو چمکتی ہوئی چیزوں سے سجایا۔ اپنے مکان کے صحن میں چھوٹا سا چمن لگوایا اور خود اس کے مالی بنے الہ آباد کے مختصر قیام اور پھر وہاں سے تعلیم کے لئے علی گڈھ آنے کا حال بھی مولوی عنایت اللہ ہی کی زبانی سنئے:۔

الہ آباد میں تعلیم کی رفتار الہ آباد میں شروع میں ہم دونوں بھائیوں کے لئے ایک ٹیچر مقرر کردیا گیا جو ہم کو انگریزی اور حساب پڑھاتا تھا۔ اور ایک مولوی صاحب فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے میرے بڑے بھائی کو گھر اس قدر یاد آیا کہ آخر کار ایک مہینے کے بعد والدہ نے انھیں دلّی بلالیا۔ بلایا مجھے بھی تھا۔ مگر میں کب ٹلتا تھا۔ والد کے پاس تنہا رہا۔ کبھی گورنمنٹ سکول الہ آباد میں پڑھا۔ اور کبھی انگریزوں کے ایک چھوٹے سے پرائیویٹ سکول میں جو مسٹر سکاٹ نامی ایک انگریز نے قائم کیا تھا اور جس میں مسٹر سکاٹ کے ساتھ ان کی بیوی اور بہن بھی بچوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ اس سکول میں صرف دو ہندوستانی طالب علم تھے۔ ایک میں اور ایک بنگالی لڑکا۔ باقی سب انگریزوں کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔

مڈل کے امتحان میں ناکامی دو برس تک اس طرح پڑھ کر غالباً ۱۸۸۰ء کے شروع میں میں نے مڈل کا امتحان پرائیویٹ دیا۔ جس میں سب مضمونوں میں تو پاس تھا مگر فارسی میں فیل ہوگیا۔ سو نمبروں میں سے ۴۰ نمبر آنے چاہئیں تھے۔ لیکن مجھے ۳۶ ملے۔ کچھ دنوں تک اس ناکامی کی بڑی شرمندگی رہی۔ فارسی کے ممتحن مولوی امجد علی صاحب ایم۔ اے تھے۔ جن کا تعلق اس وقت اودھ کے سررشتہ تعلیم سے تھا۔ بعد کے زمانے میں جب وہ علی گڈھ کالج میں پروفیسر ہوکر آئے اور میں اُن کا شاگرد ہوا تو میں نے ایک دن شکایت کی کہ آپ نے مجھے فیل کردیا تھا۔ یہ سُن کر وہ بہت ہنسے، اور کہنے لگے " اوہو! بڑا افسوس ہوا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ہو۔ ورنہ ضرور پاس کردیتا"

سیّد صاحب کا الہ آباد آنا ایک مرتبہ غالباً ۱۸۸۰ء میں سیّد صاحب بمبئی سے علی گڈھ جاتے ہوئے والد کے پاس چند گھنٹے ٹھیرے۔ باہر کے دالان میں بڑے بڑے تخت بچھے ہوئے تھے۔ اُن پر سفید چاندنی اور ایک بڑا سا گاؤ تکیہ رہتا تھا۔ سیّد صاحب دن بھر اسی پر بیٹھے رہے، میں پاس گیا تو پوچھنے لگے " اب تم کیا پڑھتے ہو؟" میں نے جہاں اور کتابیں اپنے پڑھنے کی بتائیں وہاں سکندر نامہ کا بھی نام لیا۔ کہنے لگے " اچھا ہم ایک مصرعہ پڑھتے ہیں، اس کا

مطلب بتاؤ" میں نے کہا۔ فرمائیے۔ سید صاحب نے کہا :-

ع تو فخر خراس وفا ساقط ازو

میں نے فوراً معنی کہے " تو خراسان کا فخر اور اس میں سے ف نکال دی ہے" سید صاحب نے کہا "کس میں سے نکال دی ہے؟" میں نے کہا "فخر میں سے"۔ کہنے لگے "پھر کیا رہا؟" میں نے کہا "خر" اس پر انھوں نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ جب وہ ہنسے تو میں اس لطیفہ کو سمجھا۔ معنی بتلانے کے وقت مجھ کو مطلق خیال نہ تھا کہ میں گدھا بنایا جا رہا ہوں۔

بعد ازاں ایک اور مصرع سید صاحب نے مجھ سے پوچھا جس میں "احول" کا لفظ آتا تھا میں نے کہا مجھے اس لفظ کے معنی نہیں آتے۔ اگر آپ بتا دیں تو میں مصرع کا ترجمہ کر دوں گا سید صاحب نے کہا "بھینگے کو کہتے ہیں" اس پر میں نے فوراً سارے مصرع کے معنی بتا دیئے سید صاحب اس بات سے بڑے خوش ہوئے کہ جس لفظ کے معنی مجھے معلوم نہ تھے اس کے پوچھنے میں مَیں نے کوئی شرم محسوس نہیں کی۔ اور میرے والد سے کہنے لگے "اس لڑکے کو اب ضرور علی گڑھ بھیج دینا چاہیئے"۔

اگرچہ اس موقع پر سید صاحب صرف ۱۲ گھنٹے الہ آباد میں ٹھیرے تھے مگر والد کے تمام دوستوں میں غل مچ گیا کہ "علی گڑھ کے پیر نیچر منشی ذکاء اللہ کے مکان پر مقیم ہیں"۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی تھی کہ اسی دن اتفاقاً منشی غلام غوث صاحب کا حجام ہمارے یہاں آیا۔ یہ شخص بڑا پکا مسلمان اور حاجی تھا۔ کسی مسلمان کی ڈاڑھی نہیں مونڈتا تھا۔ کپڑے بھی منشی صاحب کی وضع کے بہت اُجلے پہنتا تھا۔ (غالباً ان کی اترن ہوتے تھے) سید صاحب نے اس سے اپنے ہاتھوں کے ناخن کٹوائے۔ سید صاحب کے ناخنوں کے پیچھے گوشت آیا ہوا تھا۔ حجام کچھ اس گھبراہٹ میں کہ یہ علی گڑھ کے پیر نیچر ہیں۔ اور کچھ اُن کی شکل وصورت دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ ایک انگلی کا ناخن کاٹنے میں گوشت بھی ساتھ کاٹ دیا۔ سید صاحب نے اس صلہ میں اُسے ایک چوَنّی دی۔ یہاں سے نکلتے ہی حجام نے والد کے تمام دوستوں میں یہ خبر پہنچا دی الہ آباد میں والد کے بہت سے مسلمان دوست والد کے مذہبی خیالات سے اس بنا پر کہ وہ سید صاحب اور مہدی علی خاں صاحب وغیرہ کے ملنے والوں میں سے تھے، بدگمان رہتے

تھے۔ بعضے دوست ایسے بھی تھے جو ہمارے گھر کا پانی اس خیال سے نہیں پیتے تھے کہ پانی پینے ہی کہیں ہم بھی نیچری نہ ہو جائیں۔

الہ آباد سے بار بار علیگڈھ آنا الہ آباد کے چند سالہ قیام میں علی گڈھ سے میرا یہ تعلق رہا کہ جب کبھی والد تعطیلوں میں دہلی جاتے تھے تو علی گڈھ میں ضرور قیام کرتے تھے۔ اور میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی طرح والد دہلی جاتے ہوئے سید صاحب کے پاس ٹھیرے۔ میں ہمراہ تھا۔ اس زمانے میں سید صاحب گھانس کا تختہ بنوا رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ خواجہ محمد یوسف صاحب آگئے۔ اور باتوں باتوں میں انھوں نے سید صاحب سے کہا کہ آپ نے اس تھوڑی سی زمین میں گھانس لگانے میں صدہا روپے صرف کردیئے۔ سید صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ "تم نے نئی شادی کی ہے۔ بیوی کے لئے گہنا پاتا اور اچھے اچھے کپڑے بنوا کر تمھارا بڑا دل خوش ہوا ہوگا۔ مجھ بڈھے کی شادی اسی میں ہے کہ گھانس پھونس لگا کر دل خوش کرلوں"۔

علی گڈھ میں تعلیم پانے کا شوق اس بار بار کے آنے جانے سے مجھ کو ازحد شوق پیدا ہوگیا کہ میں بھی علی گڈھ میں تعلیم پاؤں۔ اور اس کے لئے میں نے تیاری بھی شروع کردی تھی۔ الہ آباد میں والد کے پاس "علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے ٹائپ کے اردو حروف پڑھنے کی مہارت پیدا کرلی۔ اس پرچہ میں مجھے جو چیز سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی وہ لڑکوں کے کھیل تماشوں کی رپورٹیں تھیں جن میں طالب علموں کے نام بھی چھپا کرتے تھے۔

"مسدس حالی" کو بھی میں اس زمانے میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ جونئی نئی والد کے پاس آئی تھی۔ مجھے اس کا دیباچہ بہت پسند تھا۔ مطلب تو سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر شروع کے بہت سے جملے میں نے حفظ کرلئے تھے۔

علی گڈھ جانے کی تیاری اب وقت آگیا تھا کہ ہماری مدت کی آرزو پوری ہوتی۔ والد صاحب ہماری تعلیم کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ سید صاحب کے کہنے پر انھوں نے مصمم قصد کرلیا کہ ہم دونوں بھائیوں کو وہ علی گڈھ بھیج دیں گے۔ چنانچہ بڑے دن کی تعطیل میں جب میں والد کے ساتھ

دہلی گیا تو انھوں نے وہاں مجھ کو حساب اور اقلیدس کی انگریزی اصطلاحیں یاد کرائیں۔ اب تک میں نے حساب اور ہندسہ اُردو میں پڑھا تھا جس میں عربی کی اصطلاحیں مستعمل تھیں۔ علی گڈھ میں یہ دونوں چیزیں انگریزی میں پڑھائی جاتی تھیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بھی تعطیل میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ ایک دن مجھے ساتھ لے کر چاندنی چوک گئے۔ اور وہاں ہم دونوں بھائیوں کے واسطے علی گڈھ لے جانے کے لئے سامان خریدا گیا۔ یعنی دو شیشے کی دواتیں۔ دو چاقو پنسلیں قلم۔ ایک ٹائم پیس اور دو بیگ وغیرہ خریدے گئے۔ کیا بتاؤں، ان نئی نئی چمکتی ہوئی چیزوں کے متعلق یہ سمجھ کر کہ یہ سب اب ہمیں ملیں گی دل کس قدر خوش ہوا!

تعلیم کے لئے علی گڈھ روانگی جب بڑے دن کی تعطیل ختم ہونے کو ہوئی تو والد ہم دونوں بھائیوں کو علی گڈھ لے گئے۔ اور معمولاً سیّد صاحب کے ہاں قیام کیا۔ سیّد صاحب ہم دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور اپنے دفتر کے قریب ایک بڑا کمرہ ہمارے رہنے کے لئے تجویز کیا اور اسی میں ہمارا سامان لگا دیا گیا۔ اس کمرے میں سیّد محمد علی جو سیّد صاحب کے حقیقی بھائی کے حقیقی نواسے تھے، رہا کرتے تھے۔ اب ان کو کوٹھی کے احاطے میں جو چھوٹا سا بنگلہ تھا رہنے کو دیا گیا۔ اور ہم کو اُن کا کمرہ ملا۔ بورڈنگ ہاؤس میں سیّد صاحب نے ابھی ہم کو نہیں بھیجا۔ اپنے ہی قریب رکھا۔ والد ایک دن قیام کر کے الٰہ آباد چلے گئے اور مجھ کو چند نصیحتیں ایسی کر گئے جو اس وقت تو سمجھ میں نہ آئی تھیں مگر اب بڑھاپے میں یاد آیا کرتی ہیں۔

سکول میں داخلہ دوسری یا تیسری جنوری ۱۸۸۱ء کو ہم دونوں بھائی کالج کے سکول میں داخل ہوئے۔ نسبٹ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ سیّد محمد علی جن کی عمر اُس وقت ۱۸ برس کی تھی ہم کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گئے۔ ایک بڑے رجسٹر میں جس کے کاغذ نیلے رنگ کے تھے ہم دونوں بھائیوں کے نام لکھ لئے گئے۔ مجھے مڈل کلاس میں شامل کیا گیا۔"

علی گڈھ میں تعلیم درحقیقت علی گڈھ میں داخلہ کے بعد ہی آپ کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۸۵ء میں آپ نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا۔ ۱۸۸۷ء میں ایف اے ہوئے۔ ۱۸۸۹ء میں بی اے کا امتحان دیا۔ لیکن چونکہ اس دوران میں بہت دنوں تک سخت بیمار رہے تھے۔ لہذا پرچے اچھے نہ ہوئے۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ کامیاب نہ ہو سکے۔ دوبارہ امتحان دیا اور اپریل ۱۸۹۱ء

میں بی، اے ہو گئے۔ انٹرنس اور ایف، اے کے امتحان کلکتہ یونیورسٹی کے دیے تھے۔ کیونکہ علی گڈھ
اُس وقت کلکتہ یونیورسٹی سے متعلق تھا۔ بی، اے کا امتحان الٰہ آباد یونیورسٹی کا دینا پڑا۔ اور اس میں انگریزی
فلسفہ اور ریاضی آپ کے مضامین تھے۔

بی، اے ہو جانے کے بعد آپ ایم، اے کی کلاس میں داخل ہو گئے۔ اور ایل، ایل، بی کے
لکچروں میں بھی شامل ہوتے رہے۔ مگر شدید اور مسلسل بیماری کے باعث دونوں چیزیں چھوڑنی پڑیں۔ اور
مجبوری کے ساتھ ۱۸۹۲ء میں دہلی چلے آئے۔

سرسید کی محبت و شفقت مولوی صاحب کے ساتھ

چونکہ شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ سرسید مرحوم کے خاص دوستوں میں سے
تھے اور عنایت اللہ علاوہ نہایت ہونہار، شریف الطبع اور فرمانبردار ہونے کے سبب
ہونے کے شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ کے لڑکے تھے۔ لہٰذا اسکول اور کالج کے تمام زمانہ تعلیم میں سرسید اُن
کی تعلیم و تربیت اور بالخصوص صحت جسمانی کا خاص طور پر بہت ہی انہماک کے ساتھ خیال رکھتے تھے
جب کبھی یہ بیمار ہو جاتے، بس یہ سمجھو کہ غضب آ جاتا۔ سید صاحب اطلاع ملتے ہی انھیں کوٹھی پر اپنے
پاس بُلا لیتے تھے۔ اور وہاں ان سے اتنا سخت پرہیز کراتے کہ خدا کی پناہ۔ جان آفت میں آ جاتی۔ مگر
ان کی کیا مجال تھی جو انکار کر سکتے۔ ایک مرتبہ اسی طرح انھیں کوٹھی پر بُلا لیا۔ اور خانساماں کو حکم دیا
کہ "ایک چوزے کا شوربا اور تین پھُلکے عنایت اللہ کو دونوں وقت دیا کرو۔ اور کچھ کھانے کو مت دو"
شوربا تیار ہونے کے بعد سید صاحب کے پاس جایا کرتا تھا۔ جب وہ ایک چمچہ خود پی کر اُسے پاس کر دیتے
تو پھر مولوی عنایت اللہ کو ملتا تھا۔ غرض پندرہ دن تک سوائے اس کے کچھ کھانے کو نہ ملا۔ ظاہر
ہے کہ ایک جوان آدمی سارا دن صرف تین پھلکوں پر کس طرح گذارا کر سکتا ہے۔ سخت جان مصیبت
میں آئی۔ بھوک کے مارے بُرا حال ہوتا۔ مگر قہر درویش بر جانِ درویش۔ کرتے کیا؟ ایک روز جب
بھوک سے بے حد بے چین ہوئے تو بڑی جرأت سے کام لے کر انھوں نے ڈرتے ڈرتے سید صاحب
سے کہہ ہی دیا کہ "اب میں بالکل اچھا ہو گیا ہوں۔ پرہیزی کھانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ارشاد
فرمائیں تو معمولی کھانا کھانے لگوں"۔ مگر سرسید کا یہ جواب سُن کر مولوی عنایت اللہ کی مایوسی کی حد نہ
رہی کہ "ابھی تین دن اور پرہیز کرو۔ پھر معمولی غذا ملے گی"۔ کچھ نہ پوچھئے کہ یہ تین دن کس مصیبت سے
گذرے؟ تین دن تین برس ہو گئے اور خدا خدا کر کے اس قید سے رہائی پائی۔

سرسید کو عنایت اللہ سے اپنے بچوں جیسی محبت تھی۔ اور یہ شفقت اور محبت مرتے دم تک قائم رہی۔ جو خطوط مختلف اوقات میں سرسید نے انھیں لکھے ہیں۔ یا اُن کے متعلق اُن کے والد کو لکھے ہیں اُن کے ایک ایک لفظ سے محبت اور اُلفت ٹپکی پڑتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کو اُن سے محبت نہیں عشق تھا۔ کبھی ذرا بھی اُن کی طبیعت علیل ہو جاتی تو سرسید نہایت درجہ بے چین اور مضطرب ہو جاتے۔ اور اُن کو اُس وقت تک چین نہ آتا جب تک خیریت کا خط نہ آجاتا۔ مثال کے طور پر ہم یہاں مولوی صاحب کے متعلق سرسید کے چند خطوط کے ضروری اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے اُس نہایت گہرے تعلق پر کافی روشنی پڑتی ہے جو سرسید کو مولوی عنایت اللہ سے تھا۔

مولوی عنایت اللہ صاحب نے وہ خطوط جو سرسید نے وقتاً فوقتاً انھیں لکھے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک جلد میں مجلد کرا رکھے ہیں۔ اس مجموعہ میں بعض وہ خطوط بھی ہیں جو سرسید نے اُن کے والد کو لکھے ہیں۔ یہ اقتباسات اسی نایاب قلمی مجموعہ میں سے لئے گئے ہیں[۱]۔

۲۲ مارچ ۱۸۹۲ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

عزیزی عنایت اللہ !

تمھارا خط پہنچا۔ تمھاری صحت سے نہایت خوشی اور طمانیت ہوئی۔ تمھاری علالت سے مجھ کو نہایت رنج تھا۔ اپنی والدہ صاحبہ سے میرا بہت بہت سلام کہنا۔ اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ بلاشبہ ماں سے زیادہ کسی کو عنایت اللہ سے محبت نہیں ہو سکتی۔ مگر مجھ کو بھی عنایت اللہ سے کچھ کم محبت نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ تم کو صرف محبت ہی محبت ہے۔ اور میری محبت میں کچھ عقل کا بھی میل ہے۔ تمھاری محبت خالص ہے۔ میری محبت میں ملاوٹ بھی ہے، خیر، خدا تم کو صحیح و تندرست رکھے۔ والسلام۔

---

[۱] محترمی مولوی عنایت اللہ صاحب نے نہایت مہربانی فرما کر خطوط سرسید کا یہ مجموعہ ڈیڑھ دو ماہ سے مجھے بھیج دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو میں عنقریب نہایت نفاست کے ساتھ اسے شائع کروں گا۔ میرا ارادہ ہے کہ خطوط کی نقلیں شائع نہ کی جائیں بلکہ ہر خط کا عکس لے کر اُسے اصلی حالت میں شائع کیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں سرسید کے خط کی اصلی شان کو دیکھ سکیں۔ (اسماعیل)

۲۶ر اپریل ۱۸۹۲ء کا خط ہے :-

عزیزی محمد عنایت اللہ!

تم کو کچھ یہ بھی خیال ہے کہ تمھاری صحت کا کسی اور کو بھی خیال وفکر رہتا ہے یا نہیں؟ غدر کے بعد سے دلّی کے رہنے والوں کی قلب ماہیّت ہوگئی ہے۔ اور بے مروتی چھاگئی ہے۔ تم بھی سب سے اول درجہ کے بے مروّت ہوگئے ہو۔ یہ تو مجھے یقین ہے۔ مگر تمھاری صحت کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ اپنی صحت سے مطلع کرو۔

شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ کو ۱۶ر مئی ۱۸۹۲ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

"....... تم سے میں اس لئے ناراض ہوا کہ باوجود اس قدر بیماری[۱] کے جو دہلی میں ہوئی آپ نے اور آپ کی خدا رسیدہ بیوی صاحبہ نے عنایت اللہ کو دہلی میں رہنے دیا۔ متعدد دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ آپ کو لکھوں کہ عنایت اللہ کو دہلی سے بھیج دو۔ پھر معلوم نہیں کیا کیا اوہام اور خیالات نے گھیرا کہ خط لکھا لکھایا چاک کردیا۔ اور دل کو اس بات سے تقویت دی کہ خدا پر توکل کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ خیر وعافیت سے وہ سخت زمانہ گذر گیا۔ مجھ کو تو دن رات تردّد رہتا تھا........"

۶ر دسمبر ۱۸۹۲ء کا خط خاصا پُرلطف ہے :-

عزیزی محمد عنایت اللہ!

تمھارا خط پہنچا۔ اُس سے مجھے بہت زیادہ خوشی اس خیال سے ہوئی کہ تمھاری طبیعت بہت اچھی ہے۔ اب ضرور تمھاری والدہ صاحبہ تمھارا بیاہ کردیں گی لیکن جب بیاہ کا پیغام ہو تو کہہ دینا کہ پہلے دکھادو۔ بے دیکھے نہیں کرسکتا۔ تمھاری صحت سے مجھے بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔ خدا تمھیں صحیح وتندرست رکھے۔ آمین!

۳۱ر جنوری ۱۸۹۵ء کے خط کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

عزیزی عنایت اللہ!

تمھارا خط پہنچا۔ تمھاری علالتِ مزاج کا درحقیقت مجھ کو نہایت رنج ہے۔ جو خیالات کہ تم نے

---

[۱] اپریل ۱۸۹۲ء میں دہلی میں ہیضہ کی وبا نہایت شدّت سے پھیلی تھی۔ اُس کی طرف اشارہ ہے۔

اپنے خط میں ظاہر کئے ہیں وہ لغو ہیں۔ اگرچہ فی نفسہ تمھاری ذاتی خوبیوں پر دلالت کرتے ہیں لیکن میں نے ان کو لغو اس لئے کہا کہ میرا تمھارا جو واسطہ ہے اس میں ایسے خیالات لغو ہیں میں تم کو مثل اپنے بچے کے سمجھتا ہوں۔ پس ایسی حالت میں اس قسم کے خیالات لغو ہیں......"

۱۸ر جولائی ۱۸۹۶ء کے خط کے بعض فقرے ملاحظہ ہوں:۔

"عزیزی عنایت اللہ!

تمھارا خط پہنچا۔ شکر خدا کہ مدت بعد تم کو خدا نے توفیق خط لکھنے کی دی۔ تمھارے ہمیشہ بیمار رہنے سے جس قدر مجھ کو رنج ہے، شاید تمھارے ماں باپ کو بھی اس سے زیادہ نہ ہوگا۔ مگر تقدیری اُمور میں کسی کو کچھ چارہ نہیں ہے۔ نہ تمھارے ماں باپ کچھ کر سکتے ہیں نہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔ بہر حال ہر وقت یہ خواہش رہتی ہے کہ خدا تعالیٰ تم کو صحیح اور تندرست رکھے......"

مولوی صاحب کا تعلیمی زمانہ اور علمی قابلیت

مولوی عنایت اللہ صاحب کا تعلیمی عرصہ خاصا نمایاں حیثیت میں گذرا اور وہ ایم، اے، او کالج کے ہشیار اور قابل طالب علموں میں سے سمجھے جاتے تھے۔ آپ نے تعلیم کے دوران میں دو مرتبہ انعام حاصل کیا۔ اور چار مرتبہ وظیفہ پایا۔ بی، اے ریاضی اور فلسفہ میں کیا جو دونوں مشکل اور خشک مضمون ہیں۔ نہایت صاف سلیس اور شستہ ترجمہ کرنے کی حیرت انگیز قابلیت تو آپ کو ورثہ میں ہی ملی تھی۔ ابھی آپ فورتھ ایر کلاس ہی میں تھے کہ انگریزی مضامین اور نظموں کا بہت عمدہ ترجمہ کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اس وقت کے کئے ہوئے ترجموں میں سے گرے کی مشہور و معروف نظم "ایلجی" کا نثر میں ترجمہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اور اسی سے زمانہ طالب علمی میں آپ کی لیاقت اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولوی صاحب کی علمی قابلیت کے اسباب

اس تعلیمی امتیاز اور علمی قابلیت کی وجہ شروع میں آپ کے والد ماجد کی نگرانی اور تربیت اور ازاں بعد سرسید مرحوم کی عنایت و شفقت تھی جو اُن کی تعلیم اور صحت کا بیحد خیال رکھتے تھے۔ اور اپنے بچّوں کی مانند اُن سے برتاؤ کرتے تھے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مولوی صاحب بچپن ہی سے نہایت سعادت مند۔ صالح۔ نیک طینت۔ اطاعت شعار اور صفائی پسند تھے۔

مولوی صاحب کے اساتذہ اور پروفیسر

مولوی صاحب نے سکول میں جن اُستادوں سے تعلیم پائی اُن

کے نام ماسٹر بختاور لعل۔ ماسٹر چکرورتی۔ مسٹر نسبٹ اور مسٹر ہورسٹ تھے۔ جب کالج میں پہنچے تو حسب ذیل اساتذہ سے آپ کو استفادہ کا موقع ملا۔ مسٹر تھیوڈور بک۔ پرنسپل مدرستہ العلوم۔ سر طامس آرنلڈ (مولف پریچنگ آف اسلام) سر والٹر اے۔ ریلے۔ ہیرلڈ کاکس۔ مسٹر ولس (ہیملٹ اٹھی سے پڑھی) مسٹر جادھب چندر چکرورتی شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی۔ شمس العلماء مولوی سید عباس حسین۔ شمس العلماء سید امجد علی وغیرہ۔

ان کے علاوہ ۱۸۹۵ء میں جسٹس سید محمود مرحوم سے بھی انگریزی کی بعض نظمیں پڑھی تھیں، اور ۱۸۹۸ء میں جسٹس سر محمد رفیق مرحوم سے فلسفہ اور نفسیات پر کچھ لکچر سنے جو اُن دنوں مدرستہ العلوم کے اعزازی پروفیسر تھے۔

کالج کی زندگی میں مولوی عنایت اللہ کے سخت نگراں اور نہایت شفیق اتالیق سر سید احمد خاں مرحوم تھے۔

مولوی صاحب کی قابلیت اور لیاقت کا اعتراف سرسید کی زبان سے

جب ایسے لائق اور فاضل اساتذہ پڑھانے والے ہوں اور ایسا شفیق اور بزرگ اتالیق ہو تو ظاہر ہے کہ سعادتمند اور نیک اطوار طالب علم کس قدر زیادہ لائق اور قابل بن سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ مولوی عنایت اللہ نے اپنے قابل فخر اساتذہ کی تعلیم اور صحبت سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ ہندوستان کے چوٹی کے ادیب۔ بہترین مصنف اور اُردو زبان کے سب سے زیادہ کامیاب مترجم ہیں۔ بعد کے زمانے میں جو بے نظیر اور محققانہ کتابیں مولوی صاحب نے تالیف و ترجمہ کیں یہ سب سرسید مرحوم کی تربیت کا اثر اور اپنے فاضل پروفیسروں کی تعلیم کا نتیجہ تھیں۔ زمانہ طالب علمی ہی میں اُن کی لیاقت کے جوہر کھلنے لگے تھے۔ اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد تو اُن کی علمی قابلیت اور ادبی لیاقت کا اعتراف بارہا سرسید مرحوم نے بھی کیا ہے۔ سرسید مرحوم کی دُوربیں نگاہیں ان کو ایک نہایت جوہر قابل دیکھ رہی تھیں اور درحقیقت وہ ایسے ہی ثابت بھی ہوئے۔ اسی وجہ سے سرسید کو اُن سے بے حد تعلق اور لگاؤ تھا۔ اور وہ ہر وقت اُن کی ترقی و بہبودی اور سب سے بڑھ کر اُن کی صحت و تندرستی کی فکر میں رہا کرتے تھے۔

مولوی عنایت اللہ نے بی۔ اے ہونے کے بعد دہلی میں بیٹھ کر سرسید کے فرمانے پر ابوریحان

البیرونی کی ایک بہت مختصر سوانح عمری لکھی تو اُس کے ٹائٹل پیج کے متعلق سرسید اپنے خط مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۸۹۲ء میں انھیں لکھتے ہیں:۔

"... تمھارے نام کے ساتھ مدرسۃ العلوم کا نام رہنا بلاشبہ تمھاری خوشی کا باعث ہوگا۔ لیکن میری سمجھ میں تمھارے نام کے ساتھ کالج کا نام رہنا کالج کی عزت کا باعث ہے۔ اگر کالج کے بچّے ایسے ہوں جیسے تم ہو۔ تو کون شبہ کرسکتا ہے کہ کالج کو اُس سے فخر و اعزاز نہ ہوگا پس میں نے ٹائٹل پیج میں تمھارے نام کے ساتھ کالج کا نام بھی شامل کر دیا ہے۔ اسی طرح ٹائٹل پیج چھپواؤ۔ اور اگر میری زندگی ہے اور خدا نے بھی چاہا تو قبل لفظ "آف" کے لفظ "فیلو" بھی تمھارے نام کے ساتھ بڑھایا جائے گا......"

جب بیرونی کی مختصر لائف لکھ کر مولوی عنایت اللہ نے سرسید مرحوم کو بھیجی تو اُس کی رسید دیتے ہوئے سرسید اپنے خط مورخہ ۲۵ر جنوری ۱۸۹۳ء میں لکھتے ہیں:۔

"...... رسالہ مرسلہ پہنچا۔ میں نے اس کو اول سے آخر تک پڑھا۔ جس خوبی اور عمدگی سے تم نے اسے لکھا ہے، وہ محتاج تعریف نہیں۔ میرا دل نہایت خوش ہوا کہ خدا تعالیٰ نے تم کو تالیف کی بھی اس قدر لیاقت دی ہے۔ جس پر میں اور تمھاری ماں اور باپ دونوں رشک کرنے پر آمادہ ہیں.........."

ایمرسن کے مضمون "مکافات" کے ترجمہ کے متعلق ۱۴ر جون ۱۸۹۵ء کے خط میں رقمطراز ہیں:۔

"نہایت عمدہ مضمون اور نہایت عمدہ اور بے مثل ترجمہ پہنچا۔ بجنسہٖ و بتمامہ "تہذیب" میں چھاپہ ہوگا۔ تمھارا نہایت دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں"۔

اسی مضمون کے متعلق ۹ر جولائی ۱۸۹۵ء کے خط میں اپنے دوست اور مولوی عنایت اللہ کے والد شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"...... آپ کے "تہذیب الاخلاق" میں عزیزی عنایت اللہ کا ایک مضمون انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہوا چھپا ہے۔ آپ انصاف سے اُس کو پڑھیئے گا۔ آپ کی تمام عمر ترجمہ کرنے میں گذر گئی۔ کیا آپ بھی ایسا عمدہ ترجمہ کرسکتے ہیں؟ اگر کسی ایسے مطوّل اور مشکل مضمون کا اُردو میں ایسا ترجمہ کردو تو جو کچھ کہو آپ کی نذر کردوں"۔

سر سید اپنے ۲ر فروری ۱۸۹۷ء کے خط میں جو مولوی عنایت اللہ کے نام ہے، لکھتے ہیں:۔

"........ میں یقین کرتا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ عمدہ اُردو لکھتے ہو۔ تم تو دلی کے رہنے والے ہو۔ اور میں علی گڈھ کا رہنے والا۔ اور دلی چھوڑے ہوئے مجھے دو جگ سے زیادہ ہو گئے"

جب سر سید کی فرمائش سے مولوی عنایت اللہ نے آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام کا اُردو ترجمہ شروع کیا۔ اور شروع کے چند صفحات ترجمہ کرکے سر سید کو بھیجے تو اس کے جواب میں سر سید اپنے ۵ر فروری ۱۸۹۷ء کے خط میں مولوی عنایت اللہ کو لکھتے ہیں:۔

"تمھارے مرسلہ ترجمہ کو میں نے دو دفعہ پڑھا۔ اور نہایت ہی دل خوش ہوا۔ اگر تمھارے والد ماجد نے بھی یہ ترجمہ دیکھا ہے تو وہ بھی خوش ہوئے ہوں گے۔ مگر تم کو یقین ہوگا کہ تمھاری لیاقت اور سعادت مندی سے میں تمھارے والد ماجد سے بھی زیادہ خوش ہونے والا ہوں ...... تم نے ایسا کام کیا ہے جس کی نظیر آج تک اُردو لٹریچر میں نہیں مل سکتی ....."

زمانۂ قیام دہلی کے مشاغل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ مولوی عنایت اللہ۔ ایم۔ اے۔ اور ایل۔ ایل بی میں پڑھ رہے تھے کہ بیمار ہو گئے۔ اور اس سلسلہ کو ترک کرکے انھیں ۱۸۹۲ء میں دہلی آنا پڑا۔ دہلی آنے کے بعد بیماری کی حالت میں بھی مولوی عنایت اللہ بیکار نہیں بیٹھے۔ بلکہ جہاں تک صحت اجازت دیتی برابر اور مسلسل تصنیف و تالیف اور ترجمہ میں مصروف رہتے۔ کبھی کبھی سر سید کسی کام کو علی گڈھ بلا لیا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ کوئی مضمون یا مسٹر بک یا مسٹر ماریسن کی بعض انگریزی تحریریں ترجمہ کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔

کالج کے لائبریرین اور پروفیسر ۱۸۹۳ء میں سر سید نے آپ کو کالج کی لائبریری کا انتظام سپرد کیا۔ جسے کچھ عرصہ تک آپ نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔ بعد ازاں چند دن آپ کالج میں ریاضی کے اعزازی پروفیسر رہے۔ پھر واپس دہلی چلے گئے۔

تہذیب الاخلاق کی ادارت مولوی صاحب دہلی میں تھے کہ سر سید نے شوال ۱۳۱۱ھ میں تیسری مرتبہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" کو جاری کرنا چاہا۔ اور مولوی عنایت اللہ کو اس کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ ۶۰ر ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور مولوی صاحب اپریل ۱۸۹۴ء میں علیگڈھ پہنچ گئے۔ اور کچھ کم ایک سال تک بہت قابلیت اور لیاقت کے ساتھ "تہذیب الاخلاق" کی

سب ایڈیٹری کرتے رہے۔ اس زمانے میں اکثر اعلیٰ پایہ کے مضامین سرسید کی فرمائش پر آپ نے انگریزی سے ترجمہ کرکے تہذیب الاخلاق میں شائع کئے۔

کالج کا غبن اور مولوی صاحب کا دفتر کو از سر نو مرتب کرنا

۱۸۹۵ء کا سال علی گڈھ کالج اور سرسید کے لئے نہایت منحوس تھا۔ شیام بہاری لال کالج کے ہیڈ کلرک نے ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپے کا غبن کیا۔ اور گرفتار ہونے کے بعد قید خانہ میں کچھ کھا کر مر گیا۔ اُس نے دفتر کو عمداً ردی کی حالت میں ڈال رکھا تھا۔ اُس کی دوبارہ ترتیب کے لئے سرسید نے دہلی سے مولوی عنایت اللہ کو بُلایا۔ چنانچہ وہ اپنے ۱۸ر جولائی ۱۸۹۶ء کے خط میں مولوی صاحب کو لکھتے ہیں:-

"...... شیام بہاری لال متوفی نے جو کاغذات اور رجسٹر دفتر انگریزی کے چرائے۔ اور نیز چٹھیات دفتر کی چرالیں اس سے دفتر بالکل الٹ پلٹ ہوگیا۔ اور نیز اس نے دانستہ دفتر کو ایسی حالت میں ڈال رکھا تھا۔ جیسے کہ ایک ردی کا ڈھیر۔ بہرحال جس قدر دفتر موجود ہے اُس کی از سر نو ترتیب کرنی ضرور ہوئی ہے۔ چنانچہ چٹھیات موجودہ کو بترتیب درست کر لیا ہے اب صرف اُن کا نئے رجسٹروں میں چڑھانا باقی ہے۔ اس کام میں میں تمھاری مدد چاہتا ہوں بشرطیکہ تمھاری طبیعت بصحت کامل ہو۔ اور جب بحالت صحت تمھارا یہاں آنے کا ارادہ ہو تو دو ہفتہ کے قریب تم کو کام کرنا ہوگا۔ لیکن یہی شرط ہے کہ تمھاری طبیعت بالکل صحیح اور تندرست ہو۔ پس جب تمھاری طبیعت درست ہو جائے تو چند روز کے لئے یہاں آجانا۔"

اس حکم کی تعمیل میں مولوی صاحب علی گڈھ گئے۔ اس کام میں سرسیّد کی امداد کرنے کے علاوہ دفتر کا معمولی کام بھی انجام دیتے رہے۔

پریچنگ آف اسلام کا ترجمہ اور سرسید کا انتقال

۱۸۹۷ء کا تقریباً تمام سال مولوی عنایت اللہ نے بہت مصروفیت کا کاٹا اور اس دوران میں انھوں نے بقول سرسیّد "ایسا کام کیا جس کی نظیر آج تک اردو لٹریچر میں نہیں مل سکتی"۔ یہ کام پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا اُردو ترجمہ تھا۔ جو آپ نے سرسیّد کے ارشاد اور حکم سے مدرستہ العلوم علی گڈھ کے لئے کیا تھا۔

اس مہتم بالشان اور بے نظیر کتاب کا ترجمہ آپ نے جنوری ۱۸۹۷ء میں شروع کیا۔ اور

اسی سال کے ماہ نومبر میں اُسے ختم کر دیا۔ درمیان میں چند ماہ کے لئے سید صاحب نے آپ کو علی گڈھ بُلا لیا تھا۔ علی گڈھ کے اس زمانہ قیام میں اگرچہ ترجمہ کا کام تو بند رہا مگر ایک نہایت مفید کام یہ ہو گیا کہ سرسید نے ترجمہ کے شروع کے پانچ باب بہت غور اور توجہ سے سُن لئے۔ اور اس میں کہیں کہیں ضروری ترمیم بھی کر دی۔ سرسید کے ترجمہ سننے کا طریقہ یہ تھا کہ مسودہ اپنے سامنے رکھ لیتے اور مولوی عنایت اللہ سے پڑھنے کو کہتے۔ مولوی عنایت اللہ کو سرسید کے اس قدر قریب بیٹھنا پڑتا کہ پنکھے کی ہوا سے سرسید کی ڈاڑھی کے جو بال اُڑتے وہ مولوی عنایت اللہ کی گردن پر لگتے اور اُن سے بڑی گدگدی پیدا ہوتی۔ مگر غریب کیا کرتے۔ چپ بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایک طرف یہ ہوتے دوسری طرف سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم کرسی پر بیٹھتے۔ اُن کا کام یہ تھا کہ اگر کتاب میں کوئی بات اسلام کے خلاف معلوم ہو تو ٹوکیں۔ سید صاحب ترجمہ سننے کے لئے بیٹھتے تو قلم میں ڈوبا لے کر تیار ہو جاتے اور کہتے " پڑھو" مولوی عنایت اللہ حسب الارشاد پڑھنا شروع کرتے۔ اگر پڑھنے میں ذرا بھی کہیں اٹکتے تو سید صاحب سمجھتے کہ اِس نے غلطی کی۔ فوراً ٹوکتے اور کہتے "بے وقوف سمجھے نہیں" مولوی عنایت اللہ کہتے "جی نہیں ترجمہ تو ٹھیک ہے۔" اس پر دوبارہ ترجمہ پڑھواتے اور پھر فرماتے کہ" اچھا آگے چلو"۔ کہیں کہیں اگر کسی فقرے میں ترمیم کرتے تھے یا کوئی لفظ بناتے تھے تو گویا ترجمہ میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ فقرہ میں کوئی لفظ آگے چل کر کچھ بھل سا ہو جاتا تو سوچنے لگتے۔ مولوی عنایت اللہ چونکہ فقرے کو کئی طرح سے ترجمہ کر چکے ہوتے تھے لہذا عرض کرتے کہ" اس فقرہ کو یوں بنا دیجئے"۔ فوراً اسی طرح بنا دیتے اور مترجم کی پیٹھ ٹھونکتے اور فرماتے "آخر کس کا بیٹا ہے"۔ مولوی وحید الدین سلیم کرسی پر بیٹھے بہت غور سے ترجمہ سُنا کرتے۔ مگر اعتراض بہت کم کرتے۔ ایک مرتبہ ترجمہ سن کر باہر نکلے تو مولوی عنایت اللہ سے کہنے لگے" میں تو بڑی حیرت سے یہ دیکھ رہا تھا کہ تم کس قدر صاف اور سلیس ترجمہ کرتے ہو۔"

مکمل ہو جانے کے بعد سرسید نے دسمبر ۱۸۹۷ء میں یہ ترجمہ مفید عام پریس آگرہ میں چھپنے کے لئے بھیجدیا۔ لیکن ابھی کتاب مطبع سے چھپ کر نہیں آئی تھی کہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کا انتقال ہو گیا۔ اور مولوی عنایت اللہ اپنے ایک نہایت ہی بزرگ شفیق کی عنایتوں

سے محروم ہوگئے۔

یہ کتاب سرسید نے بڑے شوق سے ترجمہ کرائی تھی۔ اور اس کی اشاعت کے متعلق اُن کے بڑے بڑے ارادے تھے۔ مگر افسوس! موت نے سب ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

مولوی صاحب کی تصانیف سرسید کے انتقال کے بعد

سرسید کے انتقال کے بعد مولوی عنایت اللہ بالعموم گھر ہی پر رہے۔ لیکن اس دوران میں ترجمہ اور تالیف کا کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہے۔ چنانچہ انگریزی "نظائر قانون" کا ترجمہ۔ مسٹر مورلین کی "امپیریل رول ان انڈیا" کے بعض ابواب کا ترجمہ۔ کپلنگ کی "جنگل بک" کی دو کہانیوں کا ترجمہ۔ "خواب پریشاں" کی تصنیف۔ ان کے علاوہ بعض انگریزی نظموں کے تراجم اور بعض تاریخی فسانوں کے ترجمے اس زمانے میں کیئے جو بعد میں مختلف اوقات میں چھپے۔

اسی زمانے میں سقراط کے حالات جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور مختلف کتابوں سے اخذ کر کے اس کی مفصل سوانح عمری مرتب کی۔ مگر افسوس ہے کہ یہ سارا مسودہ کہیں ایسا گم ہوا کہ آج تک نہ ملا۔

جون پور کی ملازمت

سنہ ۱۹۰۰ء سے آپ کی باقاعدہ اور مسلسل ملازمت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج جون پور کی منصرمی پر مقرر ہوئے۔ (اُس زمانہ میں دفتر کے چیف سپرنٹنڈنٹ کو منصرم کہتے تھے) ۷ ارمئی سنہ ۱۹۰۰ء کو آپ نے اس فتہ دارانہ عہدہ کا چارج لیا۔ آپ کی ابتدائی تنخواہ دو سو روپے ماہوار تھی۔

سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک آپ جون پور ہی میں رہے۔ ملازمت کے فرائض کی بجا آوری کے ساتھ تصنیفی شغل بھی برابر جاری رہا۔ جس کا چسکا سرسید مرحوم لگا گئے تھے۔ اس زمانہ میں آپ اُس بے نظیر لاجواب اور محققانہ تالیف کا مواد فراہم کرتے رہے جس کی ابتدا سنہ ۱۸۹۶ء سے ہوئی تھی اور جو بعد میں "اندلس کا تاریخی جغرافیہ" کے نام سے شائع ہوئی۔

بریلی کا تبادلہ

مئی سنہ ۱۹۱۴ء میں آپ کا تبادلہ جون پور سے بریلی کا ہوگیا۔ مگر بریلی میں آپ صرف نو ۹ ماہ رہے۔

ریاست گوالیار کی نوکری

بریلی کی ملازمت کے دوران میں صاحبزادہ سلطان احمد خان فینانس ممبر

کی سفارش پر ریاست گوالیار نے آپ کی خدمات گورنمنٹ سے مستعار لیں۔ اور آپ انڈر سکریٹری فینانس مقرر ہو کر جنوری ۱۹۱۵ء میں گوالیار تشریف لے گئے۔ جہاں بعد میں سکریٹری اپیل ڈپارٹمنٹ کا عہدہ آپ کو تفویض کر دیا گیا۔ گوالیار میں آپ چھ برس رہے۔

گوالیار کی ملازمت اگرچہ بہت عدیم الفرصتی کی نوکری تھی۔ مگر فرائض کی ادائیگی سے جس قدر وقت بچتا وہ آپ علمی خدمت میں بسر کرتے۔ اُس زمانہ کی یادگار پیرک لیز۔ قسطنطین۔ اور گریک امپیریلزم۔ تین کتابیں ہیں جو آپ نے دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے معاوضہ پر ترجمہ کیں۔ اندلس کے تاریخی جغرافیہ کے متعلق بھی اس دوران میں کچھ نہ کچھ کام آپ کرتے رہے۔ ڈوزی کا ترجمہ جو جونپور میں شروع کر دیا تھا یہاں آکر بھی جاری رہا۔

دارالترجمہ حیدرآباد کی نظامت

جب حیدرآباد میں ایک عظیم الشان تعلیمی انقلاب آیا اور اعلیٰ حضرت شاہ دکن خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کی اولوالعزمی اور فیاضی کی بدولت وہاں اُس مبارک یونیورسٹی کی بنیاد پڑی جس میں تمام مضامین ہندوستان کی متحدہ قومی اور ملکی زبان میں پڑھانے قرار پائے تو اس کے لئے ایک دارالترجمہ کا قیام ضروری ہوا تاکہ غیر زبانوں سے بہترین اور ضروری کتابیں جامعہ عثمانیہ کے لئے اُردو میں منتقل کی جائیں۔ اب دارالترجمہ کی نظامت اعلیٰ کے لئے ایسے قابل ادیب کی ضرورت ہوئی جو فن ترجمہ کا ماہر اور اس بحر ناپیداکنار کا پورا پورا غواص ہو۔ کارکنان کو مولوی عنایت اللہ سے بہتر اس خدمت کے لئے دوسرا شخص نہ ملا۔ چنانچہ سر راس مسعود مرحوم اور سر اکبر حیدری کی کوشش سے گوالیار سے آپ کی ملازمت بواسطۂ سرکار انگریزی اعلیٰ حضرت حضور نظام کی گورنمنٹ کے لئے منتقل کرالی گئی اور آپ نے ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء کو حیدرآباد پہنچ کر نظامت دارالترجمہ کا چارج لے لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ افسرانِ اعلیٰ نے نہایت صحیح انتخاب کیا۔ مولوی صاحب سے بہتر اس کام کے لئے ہندوستان بھر میں کوئی اور موزوں شخص نہ تھا۔ سازشوں۔ جوڑ توڑ۔ اور ریشہ دوانیوں سے بالکل الگ تھلگ۔ اور اس قسم کے ہر ایک کام سے کامل طور پر بے خبر اور نابلد۔ ہر وقت اور ہر آن علمی دھن اور ادبی اشغال میں مصروف و منہمک رہنے والا انسان ہی اس بات کا جائز حقدار تھا کہ دارالترجمہ کی کرسئ نظامت پر متمکن ہو۔ چنانچہ حق بہ حقدار رسید۔ مولوی صاحب نے جس عمدگی۔ خوبی اور لیاقت و قابلیت کے ساتھ ناظم دارالترجمہ کی حیثیت میں اپنے اعلیٰ اور نازک اور ذمہ دارانہ فرائض کو

انجام دیا وہ صرف انھی کا حصہ تھا۔ تقریباً تین سو کتابیں ان کے زمانہ نظامت میں دارالترجمہ سے غیر زبانوں کی ترجمہ ہوئیں۔ اور ایک بہت بڑا ذخیرہ مختلف علوم وفنون کا اُردو میں منتقل ہوگیا۔ لٹریچر کی اس بے نظیر خدمت کے لئے دارالترجمہ کے ناظم مولوی عنایت اللہ کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں یقیناً آبِ زر سے لکھا جائے گا۔ اور آنے والی نسلیں اُردو زبان کے اس محسن پر فخر کریں گی۔

حیدرآباد میں شروع میں آپ کی تنخواہ ۵۰۰ روپے ماہوار تھی۔ جو بعد میں ساڑھے سات ہوگئی۔ اور جب ۱۹۲۵ء میں سرکار انگریزی کی ملازمت سے آپ کی پنشن ہوگئی تو اس کے بعد آپ خالص نظام سروس میں آگئے۔ اور باقاعدہ پچاس روپے سالانہ ترقی ملنے لگی۔ یہاں تک کہ تنخواہ ایک ہزار روپے ماہوار ہوگئی۔ جو اس عہدہ کی آخری تنخواہ ہے۔ ایک ہزار روپے ماہوار آپ نے تین سال تک لئے۔ مگر افسوس ہے کہ آخری زمانہ ان کا حیدرآباد میں بہت بے لطف کٹا۔ ہر وقت اس انتظار میں رہتے کہ کب ان کی جگہ کا انتظام ہو۔ اور وہ اپنے گھر جائیں تقریباً ۳۴ برس ملازمت کے ہو چکے تھے۔

فرائض کی بجا آوری کے علاوہ نظامت دارالترجمہ کے دوران میں آپ پرائیویٹ طور پر بھی علمی خدمت کرتے رہے۔ چنانچہ تائیس۔ نجم السحر۔ تیمور اور چنگیز خاں وغیرہ کتابیں اُسی وقت لکھیں اور شائع کرائیں۔ اندلس کے تاریخی جغرافیہ کو ختم کیا۔ ڈوزی کی تکمیل کی۔ پاسکل دی گیانگوس کی تاریخ مقری کے انگریزی ترجمہ کا ترجمہ جو گوالیار میں شروع کیا تھا یہاں بھی کچھ کیا۔ ہوورتھ کی تاریخ مغل کا ترجمہ شروع کیا۔

حیدرآباد سے واپسی ناظم دارالترجمہ کے عہدے پر آپ ۱۴ سال سات دن فائز رہے۔ آخرکار نومبر ۱۹۳۴ء میں تین ماہ کی رخصت بیماری لے کر حیدرآباد سے چلے آئے۔ اور قصد کر لیا کہ اب حیدرآباد کی ملازمت نہ کریں گے۔ فروری ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد میں نظامت کا انتظام ہوگیا۔ اور اس طرح مولوی صاحب کو حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل ہوئی۔

ڈیرہ دون میں قیام حیدرآباد سے آنے کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ آپ اپنے وطن دہلی میں قیام کرتے۔ مگر آپ نے بچند وجوہات ڈیرہ دون کو اپنے رہنے کے لئے پسند فرمایا۔ جہاں کی آب وہوا

بھی عمدہ ہے اور گرمی بھی کم پڑتی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں علمی خدمت کرنے والے شخص کے لئے نہایت غنیمت ہیں۔ ڈیرہ دون میں نمی روڈ پر ۱۹۳۴ء میں آپ نے ایک چھوٹا سا بنگلہ خرید لیا تھا اب وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اس ضعیفی میں بھی برابر علمی خدمت میں مصروف ہیں:

اتنی طویل اور تھکا دینے والی ملازمت اور پھر ضعیفی و کمزوری کا نتیجہ تو یہ تھا کہ آخر عمر میں آپ کامل طور پر آرام کرتے اور بالکل فارغ ہو کر بیٹھ جاتے۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک آنکھ میں غبار رہنے، نہایت ضعیف ہو جانے، اکثر بیمار رہنے اور حافظہ کے کمزور ہو جانے کے باوجود آپ پورے انہماک کے ساتھ ٹھوس علمی خدمت میں مصروف ہیں۔ اور اس دوران میں بہت سی کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔ اور کر رہے ہیں۔ ایک روز میں نے کہا " اب تو آپ بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ یہ زمانہ تو آپ کے آرام کا ہے۔ اس قدر محنت کیوں اٹھاتے ہیں ؟" فرمانے لگے "طبیعت کو کام کرنے کی کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ بیکار بیٹھنے سے دل گھبرانے لگتا ہے۔ اسی لئے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں"۔

ترجمہ کی حیرت انگیز قابلیت

صاف سلیس اور نہایت بامحاورہ ترجمہ کرنے کی جیسی حیرت انگیز قابلیت قدرت نے آپ کو ودیعت کی ہے، اس میں ہندوستان بھر میں آپ کا کوئی اور مثیل نہیں صفحوں کے صفحے پڑھتے چلے جائیں، کہیں کوئی مشکل اور غیر مانوس لفظ نہیں ملے گا۔ اور پھر مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق کتابوں کا ترجمہ ایسی روانی کے ساتھ کرتے ہیں کہ دیکھ کر بے انتہا حیرت ہوتی ہے ایک مرتبہ خود کہہ رہے تھے کہ " انگریزی لٹریچر پڑھنے کا لطف ہی جاتا رہا۔ جب کوئی کتاب ہاتھ میں لیتا ہوں تو بجائے انگریزی الفاظ کے اُن کا اُردو ترجمہ ہی دماغ میں گشت کرنے لگتا ہے"

مولوی صاحب نے شادی نہیں کی

موجودہ زمانے کا یہ سب سے بڑا مترجم اور فاضل ادیب شادی بیاہ کے جھگڑوں سے بالکل آزاد رہا۔ اور ساری عمر نہایت وفاداری کے ساتھ عروسِ ادب کی نازبرداری میں گذار دی۔ خداوند کریم اُردو کے اس محسن کو اُردو کی خدمت کے لئے تادیر سلامت رکھے۔

تراجم اور تصنیفات کی تفصیل

مولانا کی سوانح حیات تو ہم مختصر طور پر بیان کر چکے اب آپ کی تصنیفات۔ تالیفات۔ اور مضامین وغیرہ کی ایک فہرست اور ہر ایک کتاب کی مختصر کیفیت ذیل میں درج کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین کو اُس عظیم الشان علمی خدمت کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکے جو مولوی عنایت اللہ صاحب اس وقت تک اُردو ادب کی کر چکے ہیں۔ حق یہ ہے کہ آپ نے اُردو لٹریچر میں اپنے قلم کے ذریعہ نہایت بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اور اس قابل قدر اضافہ پر اُردو کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

مولوی صاحب کی علمی خدمات کا سلسلہ ۱۸۸۸ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ آپ علی گڈھ کالج کی فورتھ ایر کلاس میں پڑھتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً بعض مضامین کا ترجمہ سرسید یا مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل کالج کے کہنے سے انگریزی سے کیا کرتے تھے۔ جو علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھپا کرتے تھے۔ لیکن آج اُن کا کوئی نام و نشان موجود نہیں۔ اسی زمانہ میں مولوی عنایت اللہ نے قانون ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے انگریزی ترجمہ میں مسٹر بک کی امداد کی۔ جسے سرسید نے اُردو میں لکھ کر مسٹر بک کو انگریزی ترجمہ کے لئے دیا تھا۔ اسی طرح شمس العلماء مولانا شبلی کے مشہور اُردو رسالہ "الجزیہ" کے انگریزی ترجمہ میں آرنلڈ صاحب کو مولوی صاحب نے امداد دی۔ اس طرح کہ سارے مقالہ کا انگریزی میں خود ترجمہ مکمل کرکے آرنلڈ صاحب کے پاس لے گئے۔ اور انھوں نے اس کی تصحیح اور ترمیم و تنسیخ کرکے اُسے تیار کیا۔ یہ انگریزی ترجمہ چھپ گیا تھا مگر اب نایاب ہے۔

۱۔ گاؤں کا قبرستان۔ شاید یہ آپ کا سب سے پہلا اُردو ترجمہ ہے جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔ تھامس گرے (۱۷۱۶ء تا ۱۷۷۱ء) ایک مشہور شاعر ہے جس نے گاؤں کے قبرستان میں غریب کسانوں کی شکستہ قبروں کے نظارہ سے متاثر ہو کر اُن کا ایک پُر درد مرثیہ لکھا۔ یہ نظم انگریزی لٹریچر میں ایک بہترین نظم مانی جاتی ہے۔ اور گرے کی ایلجی کے نام سے

مشہور ہے۔ "یہ ایلچی گری" نے فروری ۱۷۵۱ء میں لکھی تھی۔ ۱۳۷ برس کے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں مولوی صاحب نے اس کا نثر ترجمہ کیا۔ اور اس سال کی کانفرنس میں پڑھ کر سنایا جب مارچ ۱۹۳۹ء میں چند روز کے لئے مولوی صاحب پانی پت تشریف لائے اور اس کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ "کیا یہ ترجمہ کہیں شائع ہو چکا ہے؟" فرمانے لگے "یاد نہیں پڑتا" میں نے کہا "پھر آپ ڈیرہ دون پہنچ کر یہ ترجمہ مجھے بھیج دیں"۔ مولوی صاحب نے وعدہ فرمایا اور میں نے یکم مئی ۱۹۳۹ء کو کتابی شکل میں اسے شائع کر دیا۔ ۹ صفحہ کی کتاب ہے اور نظم کے ۱۳۱ شعر ہیں جن کا نثر ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس۔ آسان اور پُر اثر ہے۔

(۲) **مضمون اشاعتِ اسلام در چین و مجمع الجزائر**:- مسٹر آرنلڈ پروفیسر علی گڈھ کالج اشاعت اسلام کی تاریخ کے متعلق ایک کتاب انگریزی میں لکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے متعلق مواد فراہم کر رہے تھے۔ چنانچہ چین میں اشاعتِ اسلام کے متعلق جو مسودۂ مضمون انھوں نے تیار کیا تھا، مولوی صاحب نے قلمی مسودہ سے اُس کا اُردو ترجمہ کیا۔ اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس چہارم منعقدہ ۱۸۸۹ء میں بمقام الٰہ آباد پڑھ کر سنایا۔ بعد میں یہ مضمون کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا تھا۔

(۳) **مضمون اشاعتِ اسلام در ہند**:- مسٹر آرنلڈ کے قلمی مسودہ سے اُردو میں مولوی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا جو مصنف کے صرف سے دہلی میں طبع ہوا۔

(۴) **مضمون اشاعت اسلام ترکوں کے ذریعہ سے**:- یہ بھی متذکرہ بالا کتاب کا ایک حصہ ہے جس کا اُردو ترجمہ مولوی صاحب نے کر کے کانفرنس کے اجلاس پنجم منعقدہ ۱۸۹۰ء میں بمقام علی گڈھ سنایا۔ اور بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔

(۵) **تذکرۂ ابوریحان بیرونی**:- علمی دنیا کا کون شخص ہو گا جو بیرونی کے نام سے واقف نہ ہو۔ اس بے نظیر محقق اور زبردست فاضل کی اُردو میں یہ سب سے پہلی مختصر سوانح عمری ہے۔ جو بہت تحقیق و تلاش اور انتخاب و اقتباس کے بعد مولوی صاحب نے کانفرنس میں پڑھنے کے لئے ۱۸۹۱ء میں لکھی۔ مگر کانفرنس میں پیش نہ ہو سکی۔ اس لئے ۱۸۹۲ء کی کانفرنس کی روئیداد کے ساتھ سر سید نے اسے علیحدہ کتابی شکل میں ۱۸۹۳ء میں شائع

کر دیا تھا۔ اگرچہ ۲۸ صفحے کا مختصر رسالہ ہے مگر بڑی محنت سے مرتب ہوا تھا۔ بعد میں مولوی سید وحید الدین سلیم نے بھی اسے چھوٹی تقطیع پر چھپوا دیا تھا۔

(۶) **ترجمہ تقریر مسٹر مارلین** :- ۱۸۹۴ء میں علی گڈھ کالج میں برادرہڈ (مجلس الاخوان) کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد پڑی جس کے سکریٹری مسٹر مارلین قرار پائے۔ اس انجمن کے پہلے سالانہ جلسہ منعقدہ فروری ۱۸۹۳ء میں مسٹر مارلین نے جو تقریر انگریزی میں کی تھی، سرسید کے ارشاد پر مولوی صاحب نے اس کا ترجمہ مارچ ۱۸۹۳ء میں کیا۔ تقریر ۱۶ صفحے کی تھی۔ یہ ترجمہ ابتداءً علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں اور پھر علیحدہ کتابی شکل میں چھپا۔ علاوہ ازیں اسٹریچی ہال کے دروازے پر بھی کندہ کیا گیا۔ اور یہ کتبہ اب تک وہاں موجود ہے۔

(۷) **نیچرل سائنس کے عجائبات**
(۸) **حکایات دیو جانس حکیم**
(۹) **انسان کی زندگی کی حالت**

یہ تینوں مضامین سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے فائل (۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء) میں علی الترتیب یکم ربیع الثانی یکم جمادی الثانی اور یکم رجب کے پرچوں میں انگریزی سے ترجمہ ہو کر چھپے۔

(۱۰) **مکافات** :- یہ مضمون مشہور ادیب ایمرسن کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جو تہذیب الاخلاق میں ۱۳۱۲ھ میں ابتداءً چھپا تھا۔ اور بعد میں مئی ۱۹۳۵ء کے رسالہ "ساقی" میں ۱۶ صفحات پر شائع ہوا۔ یہی وہ مضمون ہے جس کے ترجمے پر سرسید نے مولانا ذکاء اللہ کو لکھا تھا کہ "اگر تم ایسا عمدہ ترجمہ کر دو تو جو کچھ کہو نذر کروں"

(۱۱) **ترجمہ مضمون جان فسک** :- یہ مضمون مولوی عنایت اللہ نے سرسید کی فرمائش سے ترجمہ کیا تھا۔ سید صاحب نے اپنی طرف سے اس میں کچھ اضافہ کر کے نیچے "عنایت اللہ۔ سید احمد" لکھ کر اُسے "تہذیب الاخلاق" میں شائع کیا۔

(۱۲) **خواب پریشاں** :- یہ بہت ہی پُر لطف اور مزاحیہ فسانہ ہے جو شاہجہاں بک ایجنسی دہلی نے چھوٹی جیبی تقطیع کے ۴۸ صفحات پر چھپوایا ہے۔ دراصل یہ ایک خط ہے جو ۱۸۹۴ء میں مولوی صاحب نے اپنے دوست مرزا محمد اشرف گورگانی مرحوم کو بہاولپور لکھ کر بھیجا تھا۔

(۱۳) **ترجمہ امپیریل رُول ان انڈیا**:- مسٹر مارلین نے یہ کتاب پالیٹکس پر لکھی تھی۔ جس کے پانچ چھ ابواب کا ترجمہ مولوی صاحب نے بزمانہ قیام دہلی کیا۔ مگر یہ نامکمل رہا۔ اور چھپا نہیں۔

(۱۴) **دعوتِ اسلام**:- یہی وہ معرکۃ الآرار اور مہتم بالشان کتاب ہے جس کی وجہ سے مولوی عنایت اللہ کا نام تمام اُردو داں علمی طبقہ میں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشہور ہوگیا۔ مولوی صاحب کے اُستاد پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ نے کامل دس سال کی تحقیق و تلاش اور ہندوستان اور یورپ کے تمام مشہور کتب خانوں کی چھان بین کرکے یونانی۔ لاطینی۔ جرمن۔ انگریزی۔ اطالوی۔ اسپینی۔ پرتگیزی۔ عربی۔ فارسی اور اُردو کتابوں سے اخذ و انتخاب کرکے ایک نہایت ہی بے نظیر اور بے مثل کتاب انگریزی میں تالیف کی جس میں پُر زور شواہد اور زبردست دلائل کے ساتھ یورپین مصنفین کے اس ناپاک بہتان کی تردید کی کہ "اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا ہے"! انھوں نے نہایت جامعیت اور حسن ترتیب کے ساتھ ابتدا سے اپنے زمانے تک دُنیا کے اُن تمام ممالک میں جن کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی کوششوں کی تاریخ بیان کی۔ یعنی عرب۔ شام فلسطین آرمینیا۔ کاکیشیا۔ جرجان۔ طبرستان۔ ایران۔ خراسان۔ افغانستان۔ ہندوستان۔ کشمیر۔ تبت۔ ترکستان۔ سائبیریا۔ چین۔ تاتار۔ اسپین۔ ترکی۔ البانیا۔ بلغاریا۔ سرویا۔ بوسینیا۔ مانٹی نگرو۔ روس۔ مصر۔ نوبیا۔ حبش۔ طرابلس ٹیونس الجزیرہ۔ مراکو۔ وسط افریقہ۔ کیپ کوسٹ کولونی۔ مالدیپ۔ سماٹرہ۔ جاوا۔ ملوکا۔ بورنیو۔ سلیبیز۔ فلپائن۔ زولو۔ نیوگنی۔ کریٹ۔ امریکہ کے بعض جزائر۔ ملایا۔ اور ملاکا وغیرہ۔

اس کتاب کی جامعیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ فاضل مؤلف نے اس کی ترتیب میں جن بے شمار کتابوں سے مدد لی ہے اُن کے نام باریک ٹائپ کے ۱۲ صفحات میں آئے ہیں۔ تیرہ سو برس میں ایسی بے نظیر محققانہ کتاب کوئی نہیں لکھی گئی۔ جس نے ایک طرف معترضین کے منہ بند کر دیے اور دوسری طرف اسلام کا حسین اور خوبصورت چہرہ دُنیا کو دکھایا۔ درحقیقت یہ کتاب لکھ کر جہاں آرنلڈ نے لافانی شہرت حاصل کر لی وہاں مسلمانوں پر زبردست احسان

بھی گیا اور اُن کے لئے وہ کام کیا جو خود اُن کے کرنے کا تھا۔

جب ۱۸۹۶ء کے آخر میں یہ کتاب چھپ کر ولایت سے آئی تو سر سید نے بڑے شوق اور اصرار سے مولوی عنایت اللہ سے اس کے اُردو ترجمے کے لئے کہا۔ اور خود ہر طرح امداد کا وعدہ کیا۔ اور فرمایا کہ کتاب کالج کی طرف سے چھپے گی۔ اور اس کا معاوضہ تمھیں ایک ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ چنانچہ جنوری ۱۸۹۷ء میں مولوی صاحب نے کام شروع کر دیا۔ پانچ بابوں کا ترجمہ تو مولوی صاحب نے خود سر سید کو سُنایا۔ اور انھوں نے اس میں کہیں کہیں ترمیم اور اصلاح کی جس کی مفصل کیفیت قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے۔ ان پانچ بابوں کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ "اب دہلی سے میرے پاس ایک ایک باب کا علیحدہ علیحدہ ترجمہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ جب ساری کتاب کا ترجمہ ختم کر لو تو اکٹھا بھیج دینا۔ اگر درمیان میں کوئی بات مجھ سے پوچھنے کی ہو تو خط کے ذریعہ دریافت کر لینا۔"

چنانچہ نومبر ۱۸۹۷ء میں بجز ضمیموں کے تمام کتاب کا ترجمہ ہو گیا۔ اور سر سید نے بعد اصلاح صوفی محمد قادر علی خاں صاحب مرحوم کے مطبع مفید عام میں چھپنے کے لئے آگرہ بھیج دیا۔ مگر جس کتاب کو سید مرحوم نے اس قدر شوق سے ترجمہ کرایا تھا اور جس پر اتنی محنت کی تھی، افسوس کہ اس کو مکمل چھپی ہوئی دیکھنا اُن کے نصیب میں نہ تھا۔ کتاب ابھی مطبع میں ہی تھی کہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سر سید کا انتقال ہو گیا۔ اور اُن کے انتقال سے چھ سات ماہ بعد کتاب مطبع سے چھپ کر آئی۔ پوری کتاب دو دیباچوں۔ تیرہ ابواب اور چار ضمیموں پر مشتمل ہے۔ جس میں جا بجا متعدد نقشے اور چارٹ بھی لگے ہوئے ہیں۔ صفحات ۴۹۸ ہیں۔

جب کتاب چھپ چکی تو مولوی سید زین العابدین مرحوم نے فرمایا کہ "ہمارے پاس اس وقت زیادہ گنجائش نہیں۔ آپ مقررہ معاوضہ میں کچھ کمی کر دیں"۔ مولوی صاحب نے کہا "جو آپ کی مرضی"۔ انھوں نے سات سو روپے دیئے۔ اور کہا کہ "باقی کے تین سو اُس وقت دیں گے جب یہ کتاب دوسری دفعہ چھپے گی"۔ مگر اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی۔ حالانکہ پہلا ایڈیشن عرصہ دراز سے ناپید ہے۔ سُنا ہے کہ مدراس یونیورسٹی میں اس کتاب کے کچھ اجزاء درس میں رکھے گئے تھے۔

(۱۵) **انگریزی نظائر قانون کا ترجمہ** :- مولوی احمد علی خاں صاحب سب جج نے چند نظائر قانونی ۱۸۹۹ء میں مولوی محمد عنایت اللہ صاحب کے پاس اُردو میں ترجمہ کرنے کے لئے بھیجے۔ مولوی صاحب نے جو ترجمہ کرکے بھیجا وہ اُنھیں پسند آیا۔ اور اُس کا کچھ معاوضہ بھی اُنھوں نے دیا۔

(۱۶) **زلفی** (حصہ اوّل) یہ کتاب رڈیارڈ کپلنگ کی کتاب "جنگل بک" کی پہلی کہانی سے ماخوذ ہے۔ جو آپ نے قیام دہلی کے زمانے میں تیار کی۔ اور پہلی مرتبہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۱ء کو جادو پریس جونپور سے ۶۸ صفحات پر "جنگل کی پہلی کہانی" کے نام سے شائع ہوئی۔ بعد میں اُسے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے "زلفی" کے نام سے چھاپنا شروع کیا۔ اور اب تک اس کے پانچ ایڈیشن وہاں سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ بچوں کے لئے ایک بہت ہی مزیدار اور دلچسپ کہانی ہے جس میں ایک انسان کے بچّے کا قصّہ بیان کیا گیا ہے جس نے بھیڑیئے کے بھٹ میں پرورش پائی۔ اور بھیڑیوں کے جنگل میں پل کر بڑا ہوا۔

بحیثیت زبان کی حلاوت اور شیرینی کے مولوی عنایت اللہ کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ طرزِ ادا نہایت ہی دل نشین۔ بندشیں بے حد چُست۔ عبارت بہت ہی سلیس۔ الفاظ اور فقرے دہلی کی بامحاورہ اور میٹھی زبان کا بہترین نمونہ۔ مختصر یہ ہے کہ جس قدر عمدہ۔ دلچسپ اور دلآویز زبان مولوی صاحب نے اس کتاب میں پیش کی ہے، شاید ہی اُردو لٹریچر میں اس کی مثال مل سکے۔ کتاب اگرچہ بچوں کے لئے لکھی گئی ہے مگر بڑے بڑے ادیب بھی اسے پڑھتے میں تو عش عش کر اُٹھتے ہیں۔ ادبِ لطیف کے شائقین اگر دس مرتبہ بھی اسے پڑھیں گے تو یقین ہے کہ اُن کا دل نہیں بھرے گا۔ اور پھر پڑھنے کو جی چاہے گا۔ موجودہ زمانہ کے ایک بڑے مشہور افسانہ نگار اور ادیب کا قول ہے کہ "دماغی کام کرتے کرتے جب طبیعت گھبرانے لگتی ہے تو میں "زلفی" لے کر بیٹھ جاتا ہوں" درحقیقت یہ کتاب ترجمہ نہیں ہے بلکہ جنگل بک کو پڑھ کر جو نقوش ذہن میں رہ گئے تھے انھیں مولوی صاحب نے اپنے الفاظ میں لکھا ہے۔ اور بلا مبالغہ نثر میں شاعری کی ہے۔

(۱۷) **زلفی** (حصّہ دوم) یہ کتاب ۱۲ جون ۱۹۰۲ء کو پہلی مرتبہ چھپی۔ اس کے بعد دارالاشاعت

پنجاب سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ شمس العلماء مولوی محمد اسماعیل صاحب مرحوم (میرٹھی) کو یہ قصہ اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے اپنے صرف سے اُسے چھپوایا تھا۔ شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم اور لسان العصر اکبر الہ آبادی نے بھی ان دونوں کہانیوں کی اپنے پرائیویٹ خطوط میں نہایت تعریف کی تھی۔ افسوس وہ خطوط مولوی صاحب کے پاس سے کہیں گم ہو گئے۔

(۱۸) **اندھی پھول والی کا گیت**:۔ لارڈ لٹن کے مشہور ناول "لاسٹ ڈیز آف پومپی آئی" میں سے لے کر جون پور کی ملازمت کے زمانے میں ترجمہ کیا۔ اور رسالہ مخزن لاہور میں چھپوایا۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ بعد میں بہت سے شعراء نے اسے منظوم کیا۔

(۱۹) **ارض نہرین**:۔ بابل واشور کے قدیم ترین شہروں کا زمین سے کھود کر نکالا جانا۔ اور وہاں کے قدیم تمدن کا حال ایک امریکن فاضل نے نہایت تحقیق اور تلاش سے لکھا ہے۔ یہ اس کا ترجمہ ہے۔ جو "بلاد بابل واشور کے پُرانے شہروں کا زمین سے کھود کر برآمد کیا جانا۔ اور وہاں کا قدیم تمدن" کے عُنوان سے پہلے علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں باقساط چھپا۔ اور اس کے بعد جولائی و اگست ۱۹۱۹ء کے رسالہ الناظر لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اور پھر کتابی شکل میں طبع ہوا۔

(۲۰) **عرب قدیم کا تمدّن**:۔ انگلستان کے مشہور عالم سیموئیل لینگ کی کتاب "ہیومن اوریجنز" کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔ جو علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں باقساط چھپا۔ اس مضمون میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عرب قدیم کا تمدن بابل۔ اشور اور مصر کے تمدنوں سے قدامت میں کچھ کم نہیں ہے۔

(۲۱) **پیرک لیز اور ایتھنز کا دَورِ اقبال مندی**:۔ پیرک لیز یونان کا وہ مدبر شخص تھا جس نے آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے ایتھنز کی شہری ریاستوں کو ملا جُلا کر شہنشاہی کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اس کتاب میں جو ایولین ایبٹ ایم اے کی لکھی ہوئی ہے اس مدبر کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اسی ذیل میں مصنف نے یونانیوں کے مذہب۔ ان کے دیوتاؤں کے قصّے۔ اُن کی بُت تراشی اور نقاشی کی کیفیت۔ اُن کی شاعری و تاریخ نویسی اور اُن کے آئین و

قوانین کی تفاصیل بڑی خوبی اور جامعیت کے ساتھ تحریر کی ہیں۔ یونانِ قدیم کے گوناگوں حالات معلوم کرنے کے لئے یہ ایک بہت ہی پُراز معلومات کتاب ہے۔ جو اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے لئے اس کا ترجمہ مولوی صاحب نے بزمانہ ملازمت گوالیار کیا۔ اور یہ ترجمہ ۳۴۵ صفحات پر ۱۹۲۲ء میں چھپا۔

(۲۲) **قسطنطین**:۔ قسطنطین مشہور شہر قسطنطنیہ کا بانی اور روما کا پہلا تاجدار ہے جس نے عیسائی مذہب قبول کیا۔ جان۔ بی فرتھ نے لندن سے اکتوبر ۱۹۰۴ء میں اس کی یہ مفصل سوانح عمری لکھی۔ مولوی صاحب نے گوالیار میں عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے اسے اُردو کا لباس پہنایا اور ۱۹۲۳ء میں ۳۰۰ صفحات پر یہ ترجمہ چھپا۔

(۲۳) **یونانی شہنشاہیت**: ولیم اسکاٹ فرگسن پروفیسر تاریخ قدیم ہرورڈ یونیورسٹی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جو انھوں نے جون ۱۹۱۳ء میں شائع کی۔ یہ کتاب اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو پروفیسر مذکور نے لوول انسٹیٹیوٹ واقع بوسٹن میں پڑھے تھے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں اُن باتوں کا بیان ہے جن سے یونان میں شہنشاہی حکومت کا نشوونما ہوا۔ باقی ابواب میں اُن خاص خاص شہنشاہیوں کی امتیازی خصوصیات کا ذکر ہے جو یونان میں قائم ہوئیں۔ ایتھنز اور اسپارٹا کی شہنشاہیاں۔ سکندر اعظم کی فتوحات۔ سلاطین بطلیموسی وسلیوقیہ کے حالات اور شاہان انتی گونی کے عروج و زوال کے مرقعے اس میں کھینچے گئے ہیں۔ یہ کتاب یونان کے عہد عروج کی دلچسپ تاریخ ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے لئے اس کا ترجمہ مولوی صاحب نے بزمانہ قیام گوالیار کیا۔ جو ۲۵۸ صفحات پر ۱۹۲۴ء میں چھپا۔

(۲۴) **جاپان کا تعلیمی نظم ونسق**:۔ سر راس مسعود مرحوم (ڈائرکٹر تعلیمات حیدرآباد دکن) جاپان کی تعلیمی حالت دیکھنے کے لئے رخصت لے کر وہاں گئے۔ اور ساڑھے تین مہینے جاپان میں رہ کر تعلیم کے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع کیں۔ اور واپس حیدرآباد پہنچ کر انگریزی میں اپنی سیاحت اور تحقیق کے نتائج کتابی شکل میں اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع کئے۔ اس کا اُردو ترجمہ مصنف مرحوم کے ارشاد پر مولوی صاحب نے انجمن ترقی اُردو کے لئے کیا جس کا معاوضہ نوسو (۹۰۰) روپے وصول ہوا۔ کتاب ۲۴ بابوں اور متعدد نقشوں پر مشتمل ہے۔ جس میں جاپان کے

تعلیمی حالات کے ساتھ وہاں کے سیاسی اور معاشرتی کوائف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے صفحات ۴۸۶ ہیں۔ اور بہت خوبصورت طریقہ سے شائع ہوئی ہے۔

(۲۵) **تائیس**:۔ اناطول فرانس یورپ کا مشہور و معروف مصنف اور فسانہ نگار ہے۔ جسے ۱۹۲۱ء میں اپنی ادبی خدمات کے صلہ میں نوبل پرائز بھی مل چکا ہے۔ "تائیس" اس کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ اور اپنے دل کش اسلوب بیان۔ اپنی لطافت اور سلاست۔ اپنے موضوع کی خوبی اور دلچسپی۔ اور قصہ کی دل کشی کے باعث یورپین لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتا قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں نہایت ہی شوق اور محنت کے ساتھ مولوی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا۔ مولوی صاحب کو یہ ترجمہ بے حد عزیز ہے۔ اور وہ اس کو اپنے بہترین ترجموں میں سے سمجھتے ہیں۔ کتاب میں جس قدر تلمیحات استعمال کی گئی ہیں اُن کی تفصیلات اصل قصہ میں نہیں ہیں۔ انھیں مختلف کتابوں سے تلاش کرکے بے حد محنت کے ساتھ مولوی صاحب نے آخر میں لکھا ہے۔ ان تلمیحات کی تفصیلات کی تلاش میں اصل کتاب کے ترجمے سے زیادہ محنت آئی۔ اس ترجمہ کا پہلا ایڈیشن دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ۱۹۲۷ء میں درسی تقطیع کے ۴۸۰ صفحات پر شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن بڑی تقطیع کے ۲۴۸ صفحات پر ساقی بک ڈپو دہلی نے ۱۹۳۷ء میں چھاپا۔

(۲۶) **اُندلس کا تاریخی جغرافیہ**: ہندوستان میں شاید ہی کسی مولف نے اپنی کتاب کی تالیف اور ترتیب پر اس قدر طویل اور صبر آزما محنت کی ہو جیسی اندلس کے تاریخی جغرافیہ پر مولوی عنایت اللہ نے کی۔ یہ محنت قریباً ۱۸۹۶ء سے شروع ہوئی۔ اور ۷ / دسمبر ۱۹۲۶ء کو ختم ہوئی۔

شہروں کے ناموں کی تحقیق کا شوق درحقیقت مولوی صاحب کو زمانہ طالب علمی سے تھا۔ مگر اصلی شوق ۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا۔ انھی ایام میں رام پور کے ایک صاحب نے سفرنامۂ ابن جُبیر کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مولوی صاحب نے ان سے سپین کے ایک شہر (WALLADOLID) کا عربی نام دریافت کیا۔ اُن کا جواب آیا کہ اس شہر کا عربی نام "بلادِ دلید" تھا۔ مگر جب مولوی صاحب نے اس نام کی مزید تحقیق کی تو یہ بات باطل ثابت

ہوئی۔ اور معلوم ہوا کہ یہ اُن کا محض قیاس ہی قیاس تھا۔ مولوی صاحب نے اور سینکڑوں ناموں کے ساتھ اسپین کے جغرافیہ میں اس نام کو اسپینی شکل میں لکھ کر اس کا پتہ لکھا ہے جب ۱۸۹۷ء میں مسٹر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام کا مولوی صاحب نے اُردو میں ترجمہ کیا تو اس میں سپین کے شہروں کے عربی نام مولوی صاحب مسٹر آرنلڈ سے دریافت کیا کرتے تھے۔ انھیں معلوم ہوتا تو عربی نام لکھ دیتے۔ معلوم نہ ہوتا تو اسپینی نام اُردو حروف میں لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں مولوی صاحب نے دہلی میں مولوی عبدالاحد کے مطبع سے "معجم البلدان" خریدی۔ اور مستعدی کے ساتھ اس کام کو کرنا شروع کیا۔ بریلی میں اسپین کا ایک بڑا نقشہ منگوایا۔ اور اس میں شہروں کے عربی نام جس قدر معلوم ہوتے رہے اُن پر نشان کرتے رہے۔ گوالیار کے زمانۂ قیام میں "پاسکل دی گیانگوس" کا انگریزی ترجمہ مقری مولوی صاحب نے خریدا۔ اور اس کے نوٹوں سے اسپین کے شہروں کے متعلق بہت کچھ اخذ کیا۔ حیدرآباد آنے پر آپ کو ادریسی کا جغرافیہ مع فرانسیسی ترجمہ کے ملا۔ اور اس میں سے بہت کچھ آپ کو حاصل ہوا۔ دراصل سب سے زیادہ مصروفیت کا زمانہ اس جغرافیہ پر حیدرآباد میں گذرا۔ سینکڑوں مختلف پرچوں پر جو ہزار ہا یادداشتیں وقتاً فوقتاً آپ لکھتے رہتے تھے اب اُن سب یادداشتوں کو نکالا۔ اور انھیں باقاعدہ ترتیب دیا۔ ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۲۶ء تک بڑی محنت کے ساتھ مسلسل اس کام میں مشغول رہے۔ اور جب تک جغرافیہ چھپ نہ لیا آرام سے نہ بیٹھے۔ غرض ۲۸ سال کی محنت جب ۱۹۲۷ء میں کتابی شکل میں شائقین تاریخ اور صاحبانِ ذوق کے سامنے آئی تو ہر شخص پکار اٹھا کہ ع

اس طرح کا حُسن ہو، ایسا جمال ہو

حقیقت یہ ہے کہ اس جغرافیہ کے مرتب کرنے میں مولوی صاحب نے کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ جس زبان سے اور جس کتاب سے جو کچھ ملا۔ لے کر جمع کرتے رہے۔ عربی اور انگریزی تاریخوں جغرافیوں نقشوں اور اٹلسوں میں سے جو اسپین کے متعلق تھیں کوئی کتاب باقی نہ چھوڑی جس کا نہایت غائر نظر سے مطالعہ کر کے اُس میں سے ضروری اقتباس نہ کیا ہو۔ اس حقیقت واقعہ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ دُنیا کی کسی زبان میں بھی اندلس مرحوم کے جغرافیہ

کے متعلق ایسی مکمل اور بے مثل کتاب موجود نہیں۔ اُردو زبان ایسی لاجواب اور بے نظیر کتاب پر ہمیشہ فخر کرے گی۔ اور مولوی عنایت اللہ کا یہ احسان اُردو لٹریچر پر ہمیشہ باقی رہے گا کہ انھوں نے اس کے لئے اسپین کے ادبی سمندر میں سے سالہاسال کی شناوری کے بعد ایسا گوہر آبدار برآمد کیا کہ ہر غواص ادب اُس کی آب وتاب دیکھ کر متحیر ہوگیا۔ مولوی صاحب نے یہ کتاب ایسی مہتم بالشان اور عجیب وغریب لکھی ہے کہ وہ اگر اس کے سوا ایک حرف بھی نہ لکھتے تو اکیلی یہ کتاب ادبی دُنیا میں اُن کے نام کو عزت سے زندہ رکھنے کے لئے کافی تھی۔ اس کتاب کا معاوضہ آپ کو سات ہزار سکہ عثمانیہ ملا۔ اور کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی۔ جیسی بے مثل محققانہ تالیف ہے ویسی ہی نفاست اور خوبی کے ساتھ چھپی بھی ہے۔ بہت بڑی تقطیع۔ نہایت واضح اور خوشخط کتابت۔ دیدہ زیب طباعت۔ نفیس جلد اور خوشنما نقشوں سے مزین۔ اعلیٰ درجہ کا کاغذ۔ ۵۶۰ صفحات۔ اُردو زبان کی بہت کم کتابیں اس شان سے شائع ہوتی ہیں۔ کتاب کے ابتدائی ابواب میں اندلس کا عام جغرافیہ قدیم باشندوں اور قبائل عرب وبربر کا حال مسلمانوں کے زمانہ میں وہاں کی زراعت صنعت وتجارت کی کیفیت وغیرہ کا نہایت جامع بیان ہے۔ اوراس کے بعد انتہائی تلاش وتحقیق کے ساتھ اندلس اور پرتگال کے قریباً ساڑھے آٹھ سو مقامات کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات لکھے ہیں۔ ہر ایک شہر کا پہلے تو قدیمی نام بتایا ہے۔ پھر اس شہر کی عمارات مصنوعات۔ پیداوار اور تجارت وغیرہ کا حال بیان کیا ہے۔ زاں بعد شہر کی تاریخ ابتدا سے بیان کی ہے۔ جو جو قبائل عرب وہاں وقتاً فوقتاً آباد ہوتے رہے اُن کا حال لکھا ہے اُس شہر میں جو نامور شخص گذرے ہیں اُن میں سے بعض کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ غرض تحقیق وتلاش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ اور اندلس کی تاریخ کے شائقین کے ہاتھوں میں ایسی قابل قدر کتاب دیدی ہے جس کا ایک ایک لفظ برسوں کی تلاش ومحنت کا نتیجہ ہے۔ مولوی صاحب کا یہ عظیم الشان علمی کارنامہ فی الحقیقت اُردو لٹریچر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

(۲۷) **تیمور**:۔ ایشیا کے اس عظیم الشان فاتح اور زبردست شہنشاہ کی اب تک اُردو میں کوئی مفصل سوانح عمری نہ تھی۔ ہیرلڈ لیمب ایک انگریز مصنف نے تیمور پر ایک بہت دلچسپ

اور پُر از معلومات کتاب لکھی تھی۔ نواب حیدر نواز جنگ بہادر سر اکبر حیدری کی فرمائش کی تعمیل میں مولوی صاحب نے اس کی کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا جو یکم دسمبر ۱۹۳۰ء کو ختم ہوا مولوی صاحب نے خود ہی اس کتاب کو مطبع معارف اعظم گڈھ میں بڑی نفاست کے ساتھ چھپوایا۔ آٹھ نو بہت قدیم تصاویر اور دو نقشے کتاب کی زینت ہیں ۴۹۳ صفحات ہیں کاغذ نہایت نفیس چکنا لگایا گیا ہے۔ اپریل ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب لکھ کر مولوی صاحب نے اُردو ادب میں بہت قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

(۲۸) **چنگیز خاں**:۔ صحرائے گوبی کا وہ خانہ بدوش انسان جس نے دنیا کی تین عظیم الشان شہنشاہیوں کا خاتمہ کر دیا۔ وہ ہیبت ناک بہادر جس نے دنیا کی پچاس قوموں پر حکومت کی وہ زبردست شہنشاہ جس نے کوریا سے لے کر آرمینیہ تک اور تبت سے لے کر والگا (انیل) تک اپنی سلطنت قائم کر لی۔ سارا ایشیا اور یورپ جس کے نام سے کانپتا تھا۔ وہ تاریخ میں چنگیز خاں کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ قتل و غارت اور تباہی و ہلاکت کے اس دیوتائے اعظم کی یہ مفصل سوانح عمری ہے جو ہیرلڈ لیمب نے نہایت دلچسپ انداز بیان کے ساتھ لکھی ہے۔ مولوی صاحب نے تیمور کو ختم کرنے کے بعد مولف سے اجازت لے کر اس کا ترجمہ کیا۔ اور پھر اُسے "تیمور" کی مانند نہایت نفاست کے ساتھ اعلیٰ چکنے کاغذ پر مارچ ۱۹۳۲ء میں مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپوایا۔ کتاب کے صفحات ۳۴۲ ہیں شروع میں چنگیز خاں کی ایک تصویر بھی دی گئی ہے۔ جو کسی قدیم مرقعے سے لی گئی ہے۔

تیمور اور چنگیز خاں دونوں نہایت دلچسپ اور پُر لطف کتابیں ہیں۔ پڑھ کر فسانہ کا مزا آتا ہے۔ اور مستند تاریخی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

(۲۹) **نجم السحر**:۔ رائڈر ہیگرڈ نہایت ہیبت ناک سنسنی خیز عجیب و غریب اور خلاف قیاس و عقل فسانے لکھنے میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ یہ اُسی کی کتاب "مارننگ سٹار" کا نہایت ہی پُر لطف اور سلیس ترجمہ ہے جو مولوی صاحب نے بزمانۂ قیام حیدرآباد کیا۔ قصہ نہایت دلچسپ اور مزیدار ہے۔ اور بہت عمدگی کے ساتھ ترجمہ ہوا ہے۔ یہ آج سے پانچ ہزار برس پیشتر کی مصری زندگی کا ایک بہت ہی پُر لطف مرقع ہے۔ شاہد احمد صاحب ایڈیٹر "ساقی"

حیدر آباد گئے تو مولوی صاحب سے اصرار کرکے یہ ترجمہ ساتھ لیتے آئے۔ اور ۱۹۳۵ء میں شائع کردیا صفحات ۲۷۶۔

(۳۰) **شہاب الدین ابن ماجد**:۔ یہ وہ نامور سیاح اور جہازراں تھا جس کی رہنمائی کی بدولت واسکوڈی گاما ساحل ہندوستان تک پہنچ سکا۔ یہ اس عرب سیاح کی سوانح عمری ہے۔ جو انگریزی سے ترجمہ کرکے مولوی صاحب نے جون ۱۹۳۵ء کے رسالہ "ساقی" دہلی میں شائع کرائی۔ صفحات ۱۴۔ اسے پڑھ کر تاریخ کے متعلق بڑے حیرت انگیز رازوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

(۳۱) **بابل قدیم کے تمدن کا زمانہ**:۔ مولوی صاحب کا یہ تاریخی اور تحقیقی مضمون ستمبر ۱۹۳۵ء کے رسالہ ساقی میں ۱۲ صفحات پر چھپا۔

(۳۲) **چنگیز خاں کے سوانح حیات**:۔ یہ کتاب ایک روسی مصنف کی تصنیف کے انگریزی ترجمہ سے ماخوذ ہے۔ جس نے بہت سی قدیم عربی اور فارسی تاریخوں سے اخذ کرکے یہ کتاب مرتب کی تھی۔ شائع کردہ شاہد احمد صاحب بی۔ اے۔ ایڈیٹر ساقی۔ صفحات ۶۲۔

(۳۳) **لیفٹننٹ لم ڈھیگ اور موضع مگر گھاٹ کے مگر**:۔ یہ دلاویز اور دلچسپ کہانی اپریل ۱۹۳۶ء کے رسالہ ساقی میں ۲۱ صفحات پر شائع ہوئی۔

(۳۴) **پورن چندر کی کہانی**:۔ یہ بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز فسانہ ساقی دہلی کے جون ۱۹۳۶ء کے پرچہ میں ۱۲ صفحات پر چھپا۔

(۳۵-۳۶) **سلامبو** (حصہ اوّل و حصہ دوم) شہرہ آفاق فرانسیسی انشاپرداز گستیو فلابیر کے ناول کا ترجمہ ہے جو جون ۱۹۳۶ء میں ساقی بک ڈپو دہلی نے شائع کیا۔ اس کے بعض ابواب کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے رسالہ ساقی میں چھپ کر شہرت عام حاصل کرچکے تھے۔ اس میں آج سے دو ہزار سال پہلے قرطاجنہ کی تہذیب اور اُس کی رزم و بزم کے نقشے پیش کئے گئے ہیں۔

(۳۷) **ہیرودیاس**:۔ یہ گستیو فلابیر کے ایک اور نہایت دردناک ناول کا ترجمہ ہے۔ جو جولائی ۱۹۳۶ء کے رسالہ ساقی میں ۳۴ صفحات پر چھپا۔ اور بعد میں ساقی بک ڈپو دہلی نے اسے کتابی

شکل میں بھی شائع کیا۔

(۳۸) **کلیوپٹرا**:۔ یہ مصر کی اس نہایت مشہور و معروف ملکہ کی سوانح عمری ہے جو رسالہ ساقی کے اگست ۱۹۳۶ء کے نمبر میں ۱۴ صفحات پر چھپی۔

(۳۹) **داستانِ جہنم**:۔ اٹلی کے شاعر اور مفکر اعظم ڈانٹے (۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء) نے "ڈیوائن کامیڈی" کے نام سے ایک نہایت ہی بلند پایہ اور بے مثل نظم لکھی ہے۔ جس میں خواب کی طرز پر جہنم۔ اعراف اور بہشت کا حال بیان کیا ہے۔ اس کی یہ تصنیف یورپ میں نہایت مقبول ہوئی۔ اور اسے دنیا بھر کے اعلیٰ لٹریچر میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ بیسیوں تراجم اور سینکڑوں شرحیں اس کی اس وقت تک یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکی ہیں۔ پروفیسر ہاول اس کے متعلق کہتا ہے:۔

"یہ کتاب محض دوسری دنیا کی خیالی داستان نہیں ہے۔ بلکہ ڈانٹے نے اس میں بڑی کاوش سے اپنے زمانے اور اس سے قبل کے زمانے کے علوم و فنون۔ تاریخ و روایات۔ معتقدات و توہمات کا گراں بہا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ اور زمانۂ وسطیٰ کے مسیحی اعتقادات کی روشنی میں مادی دُنیا کا نقشہ سماوی تمثیل کے رنگ میں پیش کیا ہے۔"

مولوی عنایت اللہ نے اس کتاب کے حصۂ جہنم (انفرنو) کا ترجمہ اپنے دوست مولوی شاہد احمد صاحب بی۔ اے کی فرمائش سے کیا۔ "انفرنو" کے متعلق پروفیسر وئٹ لکھتا ہے:۔

"ڈانٹے کا جہنم ہماری گناہوں سے بھری ہوئی زندگی کی تصویر ہے۔ جو تمثیلی رنگوں سے رنگی ہوئی ہے جہنم کے عذاب جو اس میں دکھائے گئے ہیں دراصل دنیوی گناہ ہیں جن میں ہم مبتلا نظر آتے ہیں۔"

کتاب اپنی نوعیت میں جس قدر بے مثل ہے۔ اس نظم کی خوش قسمتی ہے کہ اُردو مترجم بھی اس کو ایسا ہی بے نظیر ملا۔ مولوی عنایت اللہ نے یہ ترجمہ اتنا شستہ۔ اتنا فصیح و بلیغ۔ اس قدر پاکیزہ اور دلفریب کیا ہے کہ واقعات کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ اور اسے پڑھتے ہوئے بعض دفعہ تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم واقعی دوزخ میں کھڑے ہیں۔ ساقی بکڈپو نے یہ کتاب اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ۱۱۸ صفحات پر شائع کی۔ جس کے شروع میں سیّد انصار ناصری۔ بی۔ اے ایل ایل۔ بی کا دیباچہ لکھا ہوا ہے۔ جس میں ڈانٹے کی سوانح حیات سے بحث کی گئی ہے۔

(۴۰) **سمبلین**:۔ شکسپیئر کے مشہور و معروف ڈرامہ کا ترجمہ ہے۔ جو رسالہ ساقی میں جولائی ۱۹۳۶ء سے اکتوبر ۱۹۳۷ء تک شائع ہوا۔

(۴۱) **انطونی اور کلا بطرہ**:- شیکسپیئر کے مایہ ناز مشہور و معروف ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ جو نومبر ۱۹۳۶ء کے رسالہ ساقی میں ۷۵ صفحات پر چھپا۔ اور اب ترمیم و تنسیخ کے بعد کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔

(۴۲) **ہیملٹ**:- شیکسپیئر کا شہرۂ آفاق ڈرامہ ہے۔ جس کا مکمل ترجمہ جنوری ۱۹۳۷ء کے رسالہ "ساقی" میں ۸۳ صفحات پر چھپا۔ اور بعد میں کتابی شکل میں ساقی بکڈپو کی طرف سے ۱۹۸ صفحات پر شائع ہوا۔

(۴۳) **راسیلاس**:- ڈاکٹر جانسن کے اس نہایت مشہور ناول کا ترجمہ "ساقی" میں فروری ۱۹۳۷ء سے جون ۱۹۳۷ء تک بااقساط چھپتا رہا۔ پورا ناول "ساقی" کے ۸۵ صفحات میں آیا۔

		صفحات	
(۴۴)	**میکبتھ**۔	۵۴	یہ شیکسپیئر کے ڈراموں کے ترجمے ہیں۔ جو
(۴۵)	**تائمن اتھنزی**۔	۵۵	علی الترتیب رسالہ "ساقی" کے جنوری ۱۹۳۸ء
(۴۶)	**بادشاہ لی ار**۔	۵۴	جولائی ۱۹۳۸ء۔ جنوری ۱۹۳۹ء اور جولائی
(۴۷)	**اوتھیلو**۔	۶۲	۱۹۳۹ء کے پرچوں میں چھپے۔

(۴۸) **جولیس سیزر**۔ صفحات ۷۹۔ شیکسپیئر کے اس ڈرامہ کا ترجمہ مولوی صاحب نے مجھے بھیجدیا تھا۔ جو میں نے رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور کو اشاعت کے لئے دے دیا ہے۔ انشاءاللہ جنوری ۱۹۴۰ء میں شائع ہو جائے گا۔ کتابت ہو چکی ہے۔

(۴۹) **رومیو جولیٹ**۔ یہ بھی شیکسپیئر کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ ہے۔ جو مولوی صاحب نے حال میں ختم کیا ہے۔ اور عنقریب "ساقی" میں شائع ہوگا۔ یہ ترجمہ آپ نے نومبر ۱۹۳۸ء میں کیا تھا۔

(۵۰) **عبرت نامۂ اندلس**۔ پروفیسر ڈوزی کی فرانسیسی کتاب کے انگریزی ترجمہ "سپینش اسلام" کا جو مسٹر اسٹوک نے ۱۹۱۳ء میں شائع کیا، اردو ترجمہ ہے۔ جو چار حصوں اور دو مجلدات میں آپ کے سامنے ہے انگریزی کتاب مولوی صاحب کے پاس یکم دسمبر ۱۹۱۳ء کو پہنچی۔ اور آپ نے اسی وقت سے اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ شروع کر دیا۔ ابتدا میں صرف یہ خیال تھا کہ اس کتاب کا خلاصہ تیار کیا جائے۔ مگر پھر پوری کتاب کے ترجمہ کا ارادہ کیا۔ جو ۲۹ر جون ۱۹۲۹ء کو ختم ہوا۔ حیدرآباد کی ایک مجلس نے دو ہزار روپے اس کے معاوضہ میں دینے چاہے۔ مگر مولوی صاحب نے تعلیمی کونسل میں اپنا ترجمہ پیش ہونے سے روک دیا۔ اور حق ترجمہ کے ۲۰

پونڈ نقد ادا کرنے کے بعد خود ہی اس کے چھپوانے کا خیال کیا۔ مئی ۱۹۳۰ء میں جب میں حضرت مخدومی خواجہ سجاد حسین صاحب کے ہمراہ حیدرآباد گیا تو مولوی صاحب ممدوح نے میرے سپرد اس کے چھپوانے کا کام کیا۔ میری نالائقی اور سستی۔ اور مولوی صاحب کی بُردباری اور تحمّل کا یہ ترجمہ شاہکار ہے جس کے نتیجہ میں آج دس برس میں ترجمہ چھپ کر مکمّل ہوا۔

اس ترجمہ کی مکمل کیفیت مَیں مقدمہ میں لکھ چکا ہوں۔ لہٰذا یہاں ضرورت نہیں۔

(۵۱) **صلاح الدین اعظم**:۔ صلیبی جنگوں کا مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی وہ بہادر اور شجاع انسان ہے جس نے تن تنہا یورپ بھر کی متفقہ طاقتوں کا فوق العادۃ دلیری کے ساتھ نہایت کامیاب مقابلہ کیا۔ اور سب کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اولوالعزمی۔ شجاعت۔ رحم اور مروت و اخلاق کے ایسے محیر العقول کارنامے سُلطان کی زندگی میں نظر آتے ہیں کہ پڑھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے۔ اب تک سلطان کی عربی۔ انگریزی اور اُردو میں بیسیوں سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ لیکن جس جامعیت۔ خوبی اور تفصیل کے ساتھ انگریز مُورّخ لین پول نے "سلاڈین" لکھی ہے اُسے کوئی سوانح عمری نہیں پہنچتی۔ مولوی عنایت اللہ صد ہزار مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس نہایت ہی دلچسپ کتاب کا دس پونڈ حق ترجمہ ادا کر کے نہایت بے نظیر اور سلیس ترجمہ کیا۔ اس کی کتابت مَیں مکمّل کرا چکا ہوں۔ اور انشاء اللہ عنقریب شائع کروں گا۔ قریباً ساڑھے تین سو صفحے کی کتاب ہو گی جس میں بہت سے قدیم فوٹو بھی ہوں گے۔

(۵۲) **تاریخ ادبیاتِ عرب**:۔ نکلسن کی کتاب "لٹریری ہسٹری آف عربس" کے ایک باب متعلق "یمن" کا اُردو ترجمہ مولوی صاحب نے مدّت ہوئی کیا تھا۔ مگر یہ ابھی تک چھپا نہیں۔

(۵۳) **تاریخ حکومت ہائے اسلامیہ اسپین**:۔ پاسکل دی گیانگوس نے کتاب "نفح الطیب" مولفہ علامہ احمد المقری کے تاریخی حصوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا مولوی صاحب نے اس انگریزی ترجمہ کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ مگر یہ بھی ابھی تک نہیں چھپا۔

(۵۴) **تاریخ مغل**:۔ سر ہنری ہوورتھ نے "ہسٹری آف منگولز" کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں مغلوں کی تاریخ لکھی ہے جو ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۸ء تک شائع ہوئی۔ اس سے بہتر مبسوط اور مکمّل اور مفصل تاریخ مغلوں کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئی مغلوں کی ایسی ایسی سلطنتوں

اوران کے ایسے ایسے قبائل کا حال نہایت تحقیق و تلاش کر کے سپرد قلم کیا ہے کہ عام تاریخوں میں اُن کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ چین۔ ترکستان۔ بخارا۔ خیوا۔ ولگا کے کنارے۔ قرم (کریمیا) ایران۔ روس۔ قازان اور دریائے ڈانیوب کے کنارے۔ غرض جہاں جہاں مغلوں نے مختلف اوقات میں حکومت کی سب کا مفصل اور مکمل بیان بڑی جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ مغلوں کی تاریخ کے متعلق یہ ایک نہایت ہی عظیم الشان کارنامہ ہے۔ مولوی صاحب نے نہایت حیرت انگیز حرارت اور ہمت سے کام لے کر اس پیرانہ سالی ضعف و نقاہت اور بیماری کے دوران میں اس کے ترجمے پر کمر ہمت باندھی۔ اور مسلسل کام کرنے کے بعد فروری ۱۹۳۹ء میں ڈیڑھ دن میں اسے بجز آخری چند صفحات کے خاتمہ کو پہنچا دیا۔ مکمل ترجمہ مولوی صاحب نے مجھے بھیج دیا ہے قلمی مسودے کے چار ہزار صفحات ہیں۔ اصل انگریزی کتاب باریک ٹائپ کے ساڑھے تین ہزار صفحات پر ہے۔ جب اس ترجمے کی بے انتہا طوالت اور ضخامت کو دیکھتے ہیں اور مولوی صاحب کی موجودہ حالت پر نظر کرتے ہیں تو اس عمر میں اتنے عظیم الشان کام کی تکمیل پر بے انتہا حیرت ہوتی ہے۔ اور مولوی صاحب کی جواں ہمتی پر بڑا ہی تعجب ہوتا ہے۔ خدا نے چاہا تو "صلاح الدین" کی طباعت اور تیاری سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوں گا۔

(۵۵) **حیاتِ سقراط**: مولوی صاحب کی عمر چھ سات برس کی تھی جب کہ اُنھوں نے اُردو کی تیسری کتاب میں سقراط کا حال پڑھا تھا! اس کا اثر دل پر ایسا پڑا کہ بی، اے پاس کرنے کے بعد متعدد کتابوں سے انتخاب کر کے سقراط کے حالات جمع کرنے شروع کئے۔ مگر یہ مسودہ کہیں گم ہو گیا پینتالیس ~~۴۵~~ چھیالیس ۴۶ برس کے بعد اب پھر سقراط کی سوانح عمری لکھنے کا خیال پیدا ہوا! اور دو مہینے میں بہت معتبر کتابوں سے اقتباس کر کے آپ نے یہ سوانح عمری مرتب کر کے مجھے بھیجدی ہے۔ جو انشاءاللہ عنقریب شائع ہوگی۔

(۵۶) **قریطو**: یعنی سقراط کا مکالمہ اپنے شاگرد قریطو سے۔ اس کا عنوان ہے "ہمیں کیا کرنا چاہئیے"۔ یہ مکالمہ سقراط کے نامور شاگرد افلاطون کا لکھا ہوا ہے۔ یونانی سے اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا۔ اب مولوی صاحب نے اس کو اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ فلسکیپ کے ۱۳ صفحات ہیں۔ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ عنقریب ساقی میں شایع ہوگا۔

(۵۷) **مرچنٹ آف وینس**: شیکسپیئر کے اس مشہور و معروف ڈرامہ کا ترجمہ مولوی صاحب نے حال میں کیا ہے ابھی تک چھپا نہیں۔

خاکسار محمد اسماعیل